الفوائد الدراسية

في شرح

العقيدة الطحاوية

کتاب "عقیدہ طحاویہ" کی مختصر اور جامع شرح جس میں متن کے سلیس ترجمہ کے
ساتھ حل عبارت اہم اور مفید مباحث سہل اسلوب میں پیش کیے گئے ہیں

تالیف

ابو سلمان زر محمد صاحب

مکتبہ عمر فاروق

شاہ فیصل کالونی نمبر ۴ کراچی

الفوائد الدراسية
فی شرح
العقیدة الطحاویة

کتاب "عقيدة الطحاوية" کی مختصر اور جامع شرح جس میں متن کے سلیس ترجمہ کے ساتھ حلِ عبارت اہم اور مفید مباحث سہل اسلوب میں پیش کئے گئے ہیں

تالیف

ابوسلمان زرمحمد صاحب

مکتبہ عمر فاروق

4/491 شاہ فیصل کالونی کراچی

Tel: 021-34594144 Cell: 0334-3432345

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب .... الفوائد الدراسية فى شرح العقيدة الطحاوية

تالیف .... ابو سلمان زر محمد صاحب

اشاعت اول .... جون 2010ء

تعداد 1100

طابع .... القادر پرنٹنگ پریس کراچی

ناشر .... فیاض احمد 0334-3432345 021-34594144

مکتبہ عمر فاروق 4/491 شاہ فیصل کالونی کراچی

ملنے کے پتے

دار الاشاعت، اردو بازار کراچی

اسلامی کتب خانہ، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

قدیمی کتب خانہ، آرام باغ کراچی

ادارۃ الانور، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ کوئٹہ

کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار راولپنڈی

مکتبہ العارفی، جامعہ امدادیہ ستیانہ روڈ فیصل آباد

مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار لاہور

مکتبہ سید احمد شہید، اردو بازار لاہور

مکتبہ علمیہ، جی ٹی روڈ اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ

وحیدی کتب خانہ، محلہ جنگی قصہ خوانی بازار پشاور

فہرست

صفحات	عنوانات	نمبرشمار
۵	تقریظ:۔حضرت مولاناڈاکٹرمنظوراحمدمینگل صاحب........	۱
۶	انتساب...........................	۲
۷	کچھ کتاب کے بارے میں....................	۳
۹	پیش لفظ...........................	۴
۱۴	حالات مصنفؒ...........................	۵
۱۹	توحید...........................	۶
۱۹	عقیدہ کی تعریف...........................	۷
۱۹	التوفیق...........................	۸
۲۰	توحید کی اہمیت...........................	۹
۲۳	ارادہ کی تعریف...........................	۱۰
۳۶	رسالت...........................	۱۱
۳۷	نبی اوررسول میں فرق...........................	۱۲
۴۱	قرآن مجید...........................	۱۳
۴۲	صفات باری تعالیٰ...........................	۱۴
۴۳	رؤیت باری تعالیٰ...........................	۱۵
۵۲	معراج...........................	۱۶
۵۴	حوض کوثر...........................	۱۷
۵۵	شفاعت...........................	۱۸

۱۹	عہد میثاق..	۵۶
۲۰	لوح قلم..	۶۱
۲۱	عرش وکرسی..	۶۵
۲۲	فرشتوں، پیغمبروں اور کتابوں پر ایمان..	۶۸
۲۳	اہل قبلہ کی تعریف..	۶۹
۲۴	کراماً کاتبین..	۸۷
۲۵	ملک الموت..	۸۸
۲۶	عذاب قبر..	۸۹
۲۷	بعث کی تعریف..	۹۳
۲۸	افعال العباد..	۱۰۰
۲۹	خلق اور کسب کا فرق..	۱۰۰
۳۰	ایصال ثواب..	۱۰۳
۳۱	خلافت..	۱۰۸
۳۲	عشرہ مبشرہ..	۱۱۲
۳۳	معجزہ اور کرامت کا فرق..	۱۱۵
۳۴	اقسام خارق عادت..	۱۱۶
۳۵	علامات قیامت..	۱۱۷

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریظ

مناظر اسلام حضرت مولانا ڈاکٹر منظور احمد مینگل صاحب

استاد الحدیث جامعہ فاروقیہ

حامداً و مصلیاً و بعد :اس میں کوئی شک نہیں کہ اعمال کی قبولیت کا دارومدار عقائدِ صحیحہ پر ہے، اگر عقائد ہی درست نہ ہوں، تو مجاہدے وریاضات سے کچھ حاصل نہ ہوگا، اسی لئے سلف صالحین نے عقائد کی اصلاح پر بہت زور دیا۔

عقائد کے باب میں امام طحاوی رحمہ اللہ کی ''العقیدۃ الطحاویۃ'' کو اپنے اختصار وجامعیت کی بناء پر مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بلاتفریق مسلک اہلسنت والجماعت کے تمام مکاتب فکر کے ہاں اسے مسلمہ حیثیت حاصل ہے، حتی کہ غیر مقلدین جو فروعات میں مقلدین کو گمراہ اور بدعتی کہتے ہیں، عقائد کے باب میں یہی کتاب پڑھاتے ہیں۔

یوں تو اس کی عربی شروحات کافی ہیں، لیکن اردو میں کوئی ایسی شرح جو اس کے معانی ومطالب کو واضح کرے، موجود نہ تھی۔ مولانا زر محمد صاحب استاد جامعہ فاروقیہ کراچی جو ایک تحقیقی ذوق رکھنے والے عالم ہیں، انہوں نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس کی اردو شرح لکھنے کا التزام کیا۔

اپنی گوناگوں مصروفیات کے باعث مکمل کتاب تو نہ دیکھ سکا۔ چند ایک مقامات ملاحظہ کئے جو کافی تسلی بخش وحوصلہ افزاء ہیں۔

امید ہے کہ علماء وطلباء کے لئے یہ ایک بہترین کاوش ثابت ہوگی۔

(حضرت مولانا) منظور احمد مینگل (صاحب)

۱۴۲۸/۷/۴

انتساب

احقر اپنی اس صغیر، مگر مبارک کام کو اپنے والد محترم اور والدہ
مرحومہ کی طرف منسوب کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہے،
جن کی حسن تمنا، دعاؤں اور محنتوں سے اس لائق ہوا۔

رَبِّ ارحمهما كما ربَّياني صيغرا .

زرمحمد غفرلہ

کچھ کتاب کے بارے میں

العقیدۃ الطحاویۃ المسماۃ ب"بیان السنۃ والجماعۃ" تیسری صدی ہجری کے متبحر عالم، امام ابوجعفر طحاوی حنفی رحمہ اللہ کی تصنیف ہے۔"عقیدۃ الطحاویۃ" کے نام سے مشہور اور متداول یہ کتاب، مختصر ہونے کے باوجود تمام دینی عقائد کے اصول پر حاوی ہے، گویا امام طحاویؒ کا یہ رسالہ "بقامت کہتر، بقیمت بہتر" کا مصداق ہے، یہ کتاب اپنی خصوصیات اور جامعیت کی وجہ سے عقائد کی اہم کتاب شمار کی جاتی ہے، امام طحاوی کی علمی عظمت حقیقت شناسی اور حسن بیان کی وجہ سے کتاب "عقیدۃ الطحاویہ" کو احناف کے علاوہ اھل السنۃ والجماعۃ کے تمام مکاتب فکر میں شہرت ملی، عقیدۃ طحاویہ اس وقت دنیا کی تمام اہم درسگاہوں میں پڑھایا جاتا ہے۔

کتاب کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے دوسال قبل ارباب وفاق المدارس العربیہ کی تعلیمی کمیٹی نے "العقیدۃ الطحاویۃ" کو درجہ العالیہ (سادسہ) کے مجوزہ نصاب میں داخل کردیا، چنانچہ اب یہ کتاب الحمدللہ تمام مدارس میں داخل درس ہے، اس رسالہ میں اختصار کے ساتھ تمام ضروری عقائد موجود ہیں یہ اس قابل ہے کہ طلبہ اس کو زبانی یاد کریں۔

یوں تو اس کتاب کی عربی شروحات کی تعداد تیرہ تک پہنچتی ہے جن میں اکثر شراح حنفی المسلک ہیں، لیکن ہمارے نصاب میں چونکہ صرف متن داخل ہے، اس لئے طلبہ کے لئے تفصیلی اور طویل شروحات کی طرف رجوع کرنا قدرے مشکل تھا۔

احقر تین سال سے شرح عقائد کے بعد یہ کتاب پڑھا رہا ہے، اس لئے پڑھاتے وقت یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ کتاب کی کوئی ایسی شرح ہو کہ جس میں

کتاب کی مختصر جامع اور طلب غور مباحث کی تشریح آجائے، چنانچہ الفوائد الدراسیة فی شرح العقیدة الطحاویة کے نام سے یہ شرح آپ کے ہاتھوں میں ہے، تشریحات لکھتے وقت عقیدۃ الطحاویۃ کی عربی شرح "شرح العقیدة الطحاویة" مؤلفہ امام قاضی علی بن علی بن محمد بن اَبی العز الدمشقی (المتوفی ۷۹۲ھ) اور عربی کی دوسری شرح "شرح العقیدة الطحاویة" مؤلفہ علامہ فقیہ محقق عبدالغنی القنیمی المیدانی الحنفی (المتوفی ۱۲۹۸ھ) کے علاوہ شرح العقائد، مولانا محمد ادریس کاندھلوی ؒ کے علم الکلام اور دوسری کتب سے استفادہ کیا ہے، حسب ضرورت لغت اور ترکیب کا اہتمام بھی کیا ہے اور ترجمہ لکھتے ہوئے موجود اردو تراجم سے بھی جگہ جگہ استفادہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ احقر کی اس کاوش کو قبولیت عطا فرمائے اور مزید اس سے بڑے کام کی توفیق عطا فرمائے۔

طلبہ کرام اور قارئین سے التماس ہے کہ احقر کو اپنی دعاؤں میں فراموش نہ کریں۔جزاکم اللہ تعالیٰ

احقر زر محمد غفرلہ

خادم تدریس جامعہ فاروقیہ کراچی

۲۲/جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیشِ لفظ

احکام شرعیہ (یعنی جو احکام ہم کو شریعت سے معلوم ہوئے ہیں) دو قسم کے ہیں۔

(الف) کچھ تو وہ ہیں جو عمل سے تعلق رکھتے ہیں، یعنی جن میں اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے عمل کا مطالبہ ہو، بالفاظ دیگر جن میں کچھ کرنا پڑتا ہو، جیسے شریعت کا یہ حکم کہ نماز اور روزہ فرض ہے، معاملات بھی اس قسم اول ہی میں داخل ہیں۔ ایسے احکام کو احکام عملیہ اور احکام فرعیہ کہتے ہیں اور جس فن میں ان احکام کا بیان اور تفصیل ہے اس فن کا نام علم فقہ ہے۔

(ب) دوسرے کچھ احکام وہ ہیں جو اعتقاد کرنے سے تعلق رکھتے ہیں، بالفاظ دیگر جن میں کچھ کرنا نہیں پڑتا، بلکہ صرف دل سے ماننا پڑتا ہے مثلاً شریعت کا یہ حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے، حی ہے، سمیع ہے، بصیر ہے، علیم ہے۔ قیامت، جنت، دوزخ سب برحق ہیں۔ ظاہر ہے مقصود اس سے کوئی عمل نہیں، بلکہ مان لینا اور اعتقاد کر لینا ہے۔ ایسے احکام کو احکام اعتقادیہ احکام اصلیہ کہتے ہیں اور جس فن سے ان احکام کا علم ہوتا ہے اس کو علم التوحید والصفات کہتے ہیں۔ نیز اس فن کو علم اصول الدین، علم العقائد اور علم الکلام بھی کہا جاتا ہے۔ اس وقت ہمارا موضوع بحث، احکام شرعیہ کی یہ قسم ثانی ہے۔

دراصل عقائد کی بڑی اہمیت ہے۔ عقیدہ دین اسلام کی اصل اور بنیاد ہے اور عمل اسکی فرع ہے اگر عقیدہ درست نہیں تو جہنم کا دائمی عذاب ہوگا، عمل میں کوتاہی ہو، تو نجات کی امید ہے، چاہئے ابتداہی میں ہو جائے یا سزا بھگتنے کے بعد جنت میں جائے۔

علم عقائد کی تدوین کا پس منظر:

پیغمبر اسلام کی وفات تک تمام مسلمانون کا عقیدہ ایک ہی تھا، اصول وعقائد میں کوئی اختلاف اس وقت تک نہیں تھا، عقائد میں جو اختلاف پیدا ہوا، وہ صحابہ رضوان اللہ اجمعین کے

آخری زمانہ (زمانہ تابعین) میں ہوا اور پھر وقتاً فوقتاً اہل اسلام میں اصول وعقائد کا اختلاف پیدا ہوتا رہا، یہاں تک کہ تہتر (۷۳) فرقے بن گئے، جن کے اصول یہ آٹھ فرقے ہیں۔ (۱) معتزلہ (۲) شیعہ (۳) خوارج (۴) مرجئہ (۵) نجاریہ (۶) جبریہ (۷) مشبہہ (۸) اہل السنۃ والجماعۃ۔

تہتر فرقے جو مشہور ہیں ان میں بھی کئی فرقے شاخوں کی صورت میں ظاہر ہوئے ہیں جو شخص جس فرقے کا کام کرے گا اسی میں شمار ہوگا۔ اُس وقت اہل بدعت زیادہ تر "بدعة فی العقائد" کے مجرم تھے، لیکن آج کل کے مبتدعین زیادہ تر "بدعة فی الاعمال" کے مرتکب ہیں۔

اس پہلے دور میں اہلِ بدعت مختلف شکلوں میں سامنے آئے اور پھر یہ سب مستقل فرقے بنے، لیکن اہل سنت عقائد میں سب سے الگ ہی رہے، اس کے بعد اہل السنۃ کا بڑا فروعی اختلاف باہم فتویٰ میں ہوا اور تھوڑا سا اختلاف اعتقادات میں بھی ہوا لیکن اہل سنت کے اختلاف میں گروہ بندی نہیں تھی۔ فتویٰ میں چار مذاہب (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی) مدوّن ہوگئے۔ اور اعتقاد میں تین جماعتیں (اشعری، ماتریدی، حنبلی) ہوگئیں۔ مالکی اور شافعی لوگ امام ابوالحسن اشعریؒ کے تابع ہیں، اس لئے ان کو اشاعرہ کہا جاتا ہے اور حنفی لوگ امام ابومنصور ماتریدیؒ کے قول کے تابع ہیں، اس لئے ان کو ماتریدیہ کہتے ہیں۔ کبھی گمراہ فرقوں کے مقابلہ میں دونوں ہی کو صرف اشاعرہ کہہ دیتے ہیں۔ اور امام احمد بن حنبل کے مقلد حنبلی کہلاتے ہیں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ امام طحاویؒ کے معاصر، امام ابومنصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفیٰ ۳۳۳ھ) جو امام الھدیٰ کے لقب سے مشہور ہیں، تین واسطوں سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں اور یہ "ماترید" جو کہ ماوراء النھر، سمرقند کے قریب ایک گاؤں ہے وہاں کے رہنے والے تھے۔ تاویلات القرآن، کتاب المقالات، کتاب التوحید وغیرہ آپ کی گرانقدر تصانیف ہیں۔ امام ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفیٰ ۳۳۰ھ) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں سے تھے۔ ابتداء میں معتزلی

تھے، مگر قدرت کو ان سے کتاب وسنت کی حمایت واشاعت کا کام لینا تھا۔ چنانچہ انہوں نے معتزلہ کا مذہب ترک کر دیا، امام ماتریدیؒ اور ابوالحسنؒ دونوں حضرات اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد میں امام ہیں۔ صرف چند ایک مسائل میں ان کا آپس میں اختلاف ہے۔ عقائد کے اعتبار سے گو اہل السنۃ والجماعۃ میں بنیادی طور پر کوئی اہم اختلاف نہیں ہے، تاہم عقائد ماتریدیہ اس حیثیت سے ممتاز ہیں کہ ان کی تدوین فلسفہ کے اثر سے قطعاً پاک ہیں۔

(ملخص از بیان الفوائد وصدر الشواہد، مقدمۂ اہل السنّت والجماعت، واسلامی عقائد)

اسلام چونکہ ایک فطری مذہب ہے اور اسی لئے وہ انسانی فطرت کے مطابق آسان اور سلیس زبان میں عقائد، احکام اور اخلاق کی تعلیمات پر مشتمل ہے، اسلام کی اسی فطری سادگی کے سبب علم العقائد بھی ابتداء میں انتہائی سادہ اور مختصر تھا، یعنی صاف اور سلیس زبان میں عقائد صحیحہ کا بیان تھا، فلسفیانہ مباحث کو ان میں دخل نہ تھا جیسا کہ امام ابوحنیفہؒ کی کتاب ''الفقہ الاکبر'' ملا علی قاریؒ کی کتاب ''شرح فقہ الاکبر'' علامہ نسفیؒ کی کتاب ''بحر الکلام'' اور علامہ ابوشکور السالمیؒ کی کتاب ''کتاب التمہید'' اس کی کھلی مثالیں ہیں۔

لیکن جب دوسری صدی میں خلیفہ منصور (المتوفی ۱۵۸ھ) کے عہد میں جب فلسفۂ یونان کا، عربی میں ترجمہ ہوا تو مسلمانوں کا پہلی بار یونانی فلسفہ سے تعارف ہوا، اور ایک نیا طرز استدلال اور طریق بحث وفکر سامنے آیا اور اس کے نتیجہ میں خلق قرآن جبر وقدر، رؤیت باری تعالیٰ وغیرہ نئے نئے مسائل وجود میں آئے۔ دینی فلسفیوں کے اس گروہ میں معتزلہ سرفہرست تھے، جو عقل پرستی میں تجاوز کر گئے تھے، چنانچہ مختلف مسائل میں معتزلہ فلسفیانہ طرز استدلال اختیار کرتے، جس سے لوگ متاثر ہوتے اور معتزلہ کی عقلیت اور تفلسف سے علماء مرعوب ہو رہے تھے، اس لئے علماء اور متکلمین نے فلسفہ ہی کی زبان اور اصطلاحات میں بحث کر کے اسلامی عقائد ونظریات کو عقلی ونقلی دلائل سے ثابت کر دیا، لیکن یہ حضرات متکلمین محدثین کے خلاف نہ تھے، بلکہ متکلمین معتزلہ کا رد، انہیں کے ہتھیاروں سے کرتے تھے۔ بہرحال اس طرح سے متاخرین کے علم کلام میں فلسفہ کی امیزش ہوگئی،

چنانچہ متاخرین کے علم کلام میں بہت ساری کتابیں لکھی گئی ،جن میں علامہ تفتازانی کی کتاب 'شرح مقاصد، شرح عقائد' قاضی عضد الدینؒ کی کتاب "مواقف" قاضی بیضاوی کی کتاب "الطوالع والتهذيب" اورامام رازی کی کتابیں شامل ہیں،لیکن 'إحياء العلوم ''میں امام غزالیؒ نے کیا خوب کہا ہے: کہ علماء متکلمین کی غرض علم کلام سے یہ نہیں کہ اپنے عقائد کی تصحیح اس سے کریں ان کے عقائد کا ماخذ وہی چراغ نبوت ہے، علم کلام تو صرف معاندین کے الزام کے لئے تھا۔ متکلمین کا اپنا موقف امام ابن تیمیہؒ کے قول کے مطابق قرآن کریم کی نصرت ہی ہوتا تھا، یہ لوگوں کو قرآن وسنت سے دور رکھنے والے لوگ نہ تھے۔ اشیاء کی طبائع اور موجودات کے حقائق پر بحث کو فلسفہ کہتے ہیں، جبکہ علم الکلام صرف دینی حقائق پر بحث اوران کے دفاع تک محدود ہے۔

اب ہم ذیل کے سطور میں مختصراً علم عقائد کی تعریف، موضوع، غرض وغایت اور حالات مصنف نذرِ قارئین کرتے ہیں۔

تعريف علم العقائد:

هو العلم بالعقائد الدِّينيّةِ عنِ الأدِلّةِ اليقينيَّةِ.

یعنی علم عقائد، اسلامی عقائد کو یقینی دلائل کے ساتھ جاننے کا نام ہے، بالفاظ دیگر اس کی تعریف یہ ہے "**العلم الذي يقوم على إثبات العقائد الدينية عن طريق الأدلة العقلية**"، یعنی علم کلام وہ علم ہے جس میں عقلی دلائل سے فلسفہ کے مقابلے میں اسلامی عقائد ثابت کیے جائیں۔

موضوعه:

موضوع میں متقدمین و متاخرین کا اختلاف ہے، متقدمین کہتے ہیں: "**أن موضوعه ذات الله تعالىٰ إذ يبحث فيه عن أعراضه الذاتية ـ أعني صفاته الثبوتيه والسلبية وعن أفعاله.**"

اور متاخرین کا کہنا یہ ہے کہ: "**أن موضوعه المعلوم من حيث يتعلق به**

إثبات العقائد الدِّينيّة، لأنه يبحث في هذا العلم عن أحوال الصانع من الوجود والقدم لاعتقاد ثبوتها."

غايتة:

"أن يصير الإيمان والتصديق بالأحكام الشرعية محكما."

وغايته العظمىٰ: "الفوز بسعادة الدارين، الدُّنيا بالأمان، والأُخرىٰ بالفوز بالجنان والنجاة من النيران المعدَّة لأهل الكفر والطغيان."

حالات مصنف

نام ونسب:

ابوجعفراحمد بن محمد بن سلامہ بن سلمۃ بن عبدالمالک بن سلمہ الأزدي، الحجري ، المصري، الطحاوي۔اسم گرامی، احمداورکنیت ابوجعفر ہے۔
الأزدي:ازد، یمن کا ایک مشہور اور بڑا قبیلہ ہے، آپ کا تعلق چونکہ اس قبیلہ سے تھا، اس لئے ازدی آپ کی نسبت ہے۔ حجري:حجر (بفتح الحاءوسکون الجیم)قبیلہ ازد کی ایک شاخ ہے، جبکہ ازد کی دوسری شاخ کا نام ''شنوہ'' ہے، امام طحاوی کا نسبی تعلق چونکہ حجر کی شاخ سے تھا، اس لئے آپ کو حجری بھی کہاجاتا ہے۔ مصری: آپ کے آباءواجداد چونکہ فتح اسلامی کے بعد مصر میں فروکش ہو گئے تھے، اس لئے آپ کو مصری بھی کہا جاتا ہے۔ طحاوی:مصر کے ایک گاؤں ''طحاء'' میں چونکہ آپ پیدا ہوئے اس لئے آپ طحاوی کہلائے جانے لگے۔

امام طحاویؒ ایک علم وفضل کے گھرانے میں راجح قول کے مطابق ۲۲۹ھ میں پیدا ہوئے، راجح قول کے مطابق تاریخ وفات ۳۰رشوال ۳۲۱ھ ہے۔آپ کے والد محمد بھی عالم اور نہایت متقی پرہیزگار شخص تھے۔شعر میں بھی بصیرت رکھتے تھے۔آپ کی والدہ بھی نیک سیرت اور دیندار طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔

تحصیل علم:

یوں تو امام طحاویؒ نے اپنے والد گرامی سے بھی سماعت کی ہے، لیکن مستقل علم کے حصول کے لئے آپ مصر تشریف لے گئے اور وہاں جاکر ابتدائی تعلیم اپنے ماموں ابوابراہیم اسماعیل یحییٰ مزنیؒ سے حاصل کرتے رہے، آپ کے ماموں شافعی المذہب تھے اور حضرت امام شافعیؒ کے بڑے تلامذہ میں سے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتداءً امام طحاویؒ بھی شافعی

المسلک رہے، لیکن بعد میں حنفیت اختیار کر لی اور اپنے ماموں کے حلقہ درس اور مسلک کو ترک کر کے مصر میں ایک حنفی عالم امام احمد بن ابی عمران حنفی کے حلقہ درس میں شریک ہو گئے یہ حنفی عالم عراق سے تشریف لائے تھے، امام طحاوی نے ان سے با قاعدہ فقہ حنفی حاصل کرنا شروع کی، خود امام طحاویؒ فرماتے تھے کہ: ''میرے ماموں مـزنـی فقہ حنفی کی کتب کا کثرت سے مطالعہ فرمایا کرتے تھے، انہی کی دیکھا دیکھی مجھے بھی کتب حنفیہ کے مطالعہ کا شوق ہو گیا اور میں نے بھی کتب حنفیہ کا کثرت سے مطالعہ کر دیا جس کا اثر یہ ہوا کہ مطالعہ کے بعد مجھے حنفیہ کے دلائل شافعیہ کے دلائل کے مقابلہ میں زیادہ مضبوط اور محقق نظر آئے، چنانچہ حنفی مسلک اختیار کرنے کی وجہ یہی بنی۔''

سماع حدیث کے لئے سفر:

امام طحاویؒ نے امام مزنیؒ اور اپنے والد گرامی کے علاوہ مصر کے دیگر محدثین وفقہاء کی خدمت میں بھی حاضر ہو کر فقہ وحدیث کے علم کو حاصل فرمایا، بلکہ مصر میں ہر وارد ہونے والے محدث و عالم کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ فرماتے تھے۔ درحقیقت امام طحاویؒ کے شیوخ میں مصری، مغاربہ، یمنی بصری، کوفی حجازی، شامی اور خراسانی مختلف ممالک کے حضرات ہیں، جن سے آپ نے اخبار وآثار کا علم حاصل کیا، اس لئے امام طحاویؒ کے شیوخ واساتذہ بے شمار ہیں۔ آپ ایک واسطہ یعنی امام مزنیؒ کے واسطے سے، امام شافعی رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں، اور دو واسطوں سے، امام مالکؒ وامام محمدؒ کے شاگرد ہیں، اور تین واسطوں سے امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد ہیں۔

علوم حاصل کرنے کے بعد آخر وہ وقت آیا کہ اپنے زمانہ میں تحقیق مسائل اور دقتِ نظر کے لحاظ سے امام طحاویؒ کا کوئی مثل نہ رہا۔ امام طحاویؒ کے علمی کمالات نے آپ کی ذات گرامی کو طالبانِ حدیث وفقہ کا مرجع بنا دیا تھا، اختلاف مذہب ومشرب کے باوجود، دور دراز سے طالبانِ علوم، سفر کی صعوبتیں اٹھا اٹھا کر علمی استفادہ کے لئے آپ کے پاس آتے تھے۔

امام طحاوی کا علمی مقام:

قافلہ علم میں بہت کم ایسے حضرات نکلیں گے، جو بیک وقت حدیث وفقہ اور اصول فقہ میں امام طحاویؒ کے علمی مقام تک پہنچے ہو، امام طحاویؒ کو "أعلم الناس بمذهب أبي حنيفةؒ" کہا گیا۔ امام طحاویؒ حفظِ حدیث کے ساتھ ساتھ اجتہاد میں بھی بہت بلند مقام رکھتے تھے، حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: "امام طحاوی مجتہد منتسب تھے، محض امام ابوحنیفہؒ کے مقلد نہ تھے، کیونکہ آپ نے بہت سے مسائل میں ابوحنیفہ کے مذہب سے اختلاف کیا ہے۔"

امام طحاویؒ کے ہم عصر محدثین:

امام طحاویؒ کا زمانہ تیسری صدی ہجری ہے اور جتنے مصنفین صحاح ستہ کے ہیں، سب تیسری صدی ہجری کے ہیں، چنانچہ حضرت امام بخاری، امام مسلم، امام احمد بن حنبل، ترمذی ابوداؤد، امام یحیٰی بن معین، نسائی، ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ، یہ سب ائمہ حدیث جو کہ کسی تعارف کے محتاج نہیں، امام طحاوی رحمہ اللہ کو ان کے ہم عصر ہونے کا شرف حاصل رہا۔ جن اساتذہ سے امام نسائی، امام ابن ماجہ اور امام مسلم رحمہم اللہ نے پڑھا ہے، ان میں سے بعض اساتذہ سے امام طحاویؒ نے بھی پڑھا ہے۔

تصانیف:

امام طحاویؒ کی مشہور تالیفات یہ ہیں۔

(۱) "مشكل الاثار" جس کا اصلی نام "مشكل الحديث" ہے۔

(۲) عالیہ (دورۂ حدیث) میں داخلِ درس، معانی الاثار جو کہ متن ہے، جبکہ اس کی شرح "شرح معاني الاثار" کے مصنف عبدالقادر القرشی (التوفی ۷۷۵ھ) ہیں۔ (۳) "مختصر الطحاوي في الفقه الحنفي" (۴) "سنن الشافعي" (۵) "عقيدة الطحاوية" وغیرہ۔

بسم الله الرحمن الرحيم

بسم اللّٰه الرَّحمٰن الرحيم

هـذا مـا رواه الإمـام أبـوجعفر الطّحاوي في ذكر بيان اعتقاد أهل السـنَّةِ والـجـمـاعة على مذهب فقهاء الملّة أبي حنيفةَ النعمان بن ثابت الـكوفيّ وأبي يوسف يعقوبَ بن إبراهيم الأنصاريّ وأبي عبداللّٰه محمدِ بـن الحسن الشيبانيِّ رضوان اللّٰه تعالىٰ عليهم أجمعين وما يعتقدُون من اُصول الدّين و يدِيُنونَ به لرب العالمين.

یہ (مـاحـضـرفي الذهن) وہ تحریر ہے جس کو شیخ امام ابوجعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی ہے، اہل سنت والجماعت کے اس عقیدہ کے تذکرہ کے سلسلے میں جوملت اسلامیہ کے فقہاء (امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت الکوفی رحمۃ اللہ علیہ، ابویوسف یعقوب بن ابراہیم الانصاری رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابی عبداللہ محمد بن الحسن الشیبانی رحمہم اللہ) کے عقیدہ کے مطابق ہے، اور ان اصول دین (عقائد) کے تذکرہ کے سلسلے میں بیان ہوگا، جن کا یہ حضرات عقیدہ رکھتے ہیں اور رب العالمین کے لئے جس کو وہ اپنا دین بنائے ہوئے ہیں۔

هذا: ما حضـرفي الذهن کی طرف اشارہ ہے۔ ما: بمـعنى الذي.

الإمام وہ عالم جس کی اقتداء کی جائے۔ (مصباح اللغات)

هٰـذا مـارواه: عبارت کے شروع کا یہ حصہ یا تو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے کسی شاگرد نے بطور الحاق کے ذکر کیا ہے، کیونکہ اہل اللہ اپنی تعریف وتوصیف بیان کرنے سے گریز کرتے ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ عبارت خود امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہو، تحدیث بالنعمۃ کے طور پر اپنی ذات کے لئے تعریفی کلمات استعمال کیے۔

السنة: أی السيرة والطريقة المحمّدية ۔ والجماعة: ای أهل الجماعة

من الصحابة والتابعين ومن بعدهم، من المتبعين للنبي ﷺ. فقهاء الملة : مبدل منہ،أبی حنیفة بدل ہے۔ وما یعتقدون کا، "فی ذکر بیان" میں "بیان" پرعطف ہے أی في ذکر ما یعتقدون۔ ویدینون به کاعطف وما یعتقدون پرعطف تفسیری ہے، کیونکہ دین بنانا اور عقیدہ رکھنا دونوں کا حاصل ایک ہی ہے۔

توحید

> قال الإمام وبه قال الإمامان المذکوران رحمهما اللّٰه تعالٰی: نقول في توحید اللّٰه معتقدین بتوفیق اللّٰه:إنّ اللّٰه تعالٰی واحد لاشریک له.
>
> امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور صاحبین (امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ:توفیق الٰہی کا عقیدہ رکھتے ہوئے توحید باری تعالیٰ کے متعلق ہم (عقیدتاً) یہ کہتے ہیں کہ:اللہ تعالیٰ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔

قال الإمام: امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: **وبه:** ای بقول الإمام۔

الامامان المذکوران: صاحبین.

معتقدین : یہ نقول کی ضمیر فاعل سے حال ہے،اعتقاد سے مشتق ہے،اعتقد الامر :نہایت پختہ یقین رکھنا۔

عقیدہ کی تعریف

العقیدة مایقصد فیه نفس الاعتقاد دون العمل. (التعریفات:۸)

عقیدہ وہ ہے۔جس پر پختہ یقین کیا جائے ،جس کو انسان اپنا دین بنائے اور اس کا اعتقاد رکھے،عقیدہ ہی تمام دین کی اساس اور جڑ ہے۔

التوفیق

جعل اللّٰه تعالٰی قولَ العبد وفعلَه موافقًالأمره ونهیه.

اللہ تعالیٰ جب بندہ کا قول اور فعل اپنے امر اور نہی کے موافق بنادے،بس یہی توفیق ہے۔

توفیق کی مشہور تعریف بالفاظ دیگر یہ ہے "جعل الأسباب نحو المطلوب الخیر" (دستور العلماء) نقول فی توحید اللہ الخ کا مطلب یہ ہوا کہ الاعتقاد بتوفیق من اللّٰہ تعالیٰ لنا، لابقوتنا یعنی ہم اللہ کی توفیق کے سہارے پر اللہ کی توحید کے بارے میں بیان شروع کر رہے ہیں۔

نوٹ:۔ "إن اللّٰہ" سے لیکر کتاب کے آخر تک یہ نقول کا مقولہ ہے، پھر "نقول" اپنے مقولہ سے مل کر مقولہ ہوا، مصنف کے قول "قال الإمام" کا۔

"لاشریک لہ" "واحد" کی تشریح ہے یعنی "وحدانیت" ایک سلبی صفت ہے، جو تین انواع، وحدۃ فی الذات، وحدۃ فی الصفات اور وحدۃ فی الافعال پر بولا جاتا ہے أي لاشریک لہ فی ذاتہ ولافي صفاتہ ولا في أفعالہ۔ "واحد" کا استعمال "أحدٌ" کے معنی میں ہے، یعنی یکتا ولا ثانی، اسماء حسنیٰ میں اسی معنی کے لحاظ سے ہے۔
(مصباح اللغات)

اللہ کے واحد ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ شانہ کی ذات قابل تجزی نہیں، نہ صفات میں کوئی اس کا نظیر ہے نہ افعال میں کوئی اس کا شریک ہے۔ (مرقاۃ، شرح مشکوٰۃ، بیان الفوائد: ۱۵۵)

التوحید: مصدر ہے، باری تعالیٰ کی وحدانیت کا اعتقاد۔

توحید کی اہمیت

عقیدہ توحید، اسلام کا سب سے پہلا بنیادی عقیدہ ہے، یہی عقیدہ دین کی اصل بنیاد ہے، کیونکہ توحید ایک بدیہی اور فطری امر ہے، یوں تو شرح صدر کے بہت سے اسباب ہیں، مگر شرح صدر کا سب سے قوی اور اہم سبب توحید ہے۔ (زادالمعاد)

حقیقی اور خالص توحید کا فخر صرف اسلام کو حاصل ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا اصل مقصد توحید ہے، تمام انبیاء کا سب سے پہلا اور اہم سبق اللہ کی توحید ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء و مرسلین کا اجماع عقیدۂ توحید پر رہا ہے، فرمایا: ﴿وماأرسلنا من قبلک مِنْ رَّسولٍ إلاَّ نوحِيْ إلیہ أنہ لاإلٰہ إلاَّأنا فاعبدون﴾ [انبیاء: ۲۵] قرآن عظیم میں

پونے دوسو آیات اور سو احادیث نبویہ میں عبادت کو صرف ایک اللہ کا خاصہ بتلایا گیا ہے ۔توحید کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نبوت کے بعد مکی زندگی میں صرف توحید سمجھانے کے لئے تیرہ برس صرف کئے اور مدنی زندگی میں باقی شریعت کے لئے دس سال لگائے۔

ولاشيء مثلُه ولا شيء يُعجزه ولاإلٰه غيره . نہیں ہے اس کی طرح کا سا کوئی (اس جیسی کوئی چیز نہیں) اور کوئی چیز اللہ کو عاجز نہیں کرسکتی اور اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

ولاشيء مثله: باری تعالیٰ کے اس قول:﴿**ليس كمثله شيء وهو السميع البصير**﴾ کی طرف اشارہ ہے، نیز ماقبل صفت وحدت کی تاکید ہے، کیونکہ مثل کا نہ ہونا وحدت کی دلیل ہے۔اگر اللہ کا مثل ہوتا، تو پھر اللہ واحد بھی نہ ہوتا۔حاصل یہ کہ نہ ذات میں اس کا کوئی مماثل ہے، نہ صفات میں، نہ افعال میں، بے شک وہ ہر چیز کو دیکھتا، سنتا ہے، مگر اس کا دیکھنا سننا بھی مخلوق کی طرح نہیں، جس کی کیفیت بیان کی جاسکے۔ وہ مخلوق کی مشابہت ومماثلت سے بالکلیہ پاک اور مقدس ومنزہ ہے، پھر اس کی صفات کی کیفیت کس طرح سمجھ میں آجائے۔(ملخص از فوائد عثمانیہ)

اللہ کی ذات وصفات کو اپنی ذات وصفات پر قیاس کرنا، نادانی ہے، اللہ کی ذات وصفات کے متعلق زیادہ بحث وتفتیش کرنا اس کی کیفیتوں میں غور وخوض کرنا کج فہمی کی دلیل ہے، غرضیکہ اللہ تعالیٰ علیم وخبیر وبصیر ہے، مگر ہماری طرح نہیں، بدون مضغہ لحم کے ادراک کرتا ہے اور بغیر کان کے سنتا ہے اور بغیر آنکھ کے دیکھتا ہے بدون زبان کے کلام کرتا ہے ہماری طرح ان اعضاء وجوارح کے محتاج نہیں،"**لاشیء مثله**" سے مشبہ ومعطلہ کی تردید ہے۔

ولاشيء يعجزه: عجز اہل سنت کے ہاں امر وجودی ہے، جو قدرت کی ضد ہے، ارشاد باری ہے:﴿**وما كان الله ليعجزه من شيء في السموات ولا في الارض انه كان عليما قديرًا**﴾(فاطر:٤٤)

اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہے کہ کوئی چیز (قوت والی) اس کو عاجز کر سکے، نہ آسمان میں اور نہ زمین میں (کیونکہ) وہ بڑے علم والا اور بڑی قدرت والا ہے، پھر معاذ اللہ عاجز ہو تو کدھر سے ہو۔

ولا اِلٰه غیره : ولا الـه ای فی الوجود۔ اِلٰہ بروزن فِعالٌ بمعنی اسم مفعول مـألُـوهٌ کے ہیں، یعنی معبود، ہر قوم کے نزدیک جس کی بندگی کی جائے وہ الٰہ ہے، خواہ معبود برحق ہو یا معبود باطل، اس جملے میں کلمہ توحید ''لا الٰه الا اللّٰه'' کی طرف اشارہ ہے۔

قديمٌ بِلاابتداءٍ ، دَائمٌ بِلا انتهاءٍ، لايفنٰی ولا يبيد.
اللہ تعالیٰ ایسا قدیم ہے، جس کی ابتدا نہیں اور ہمیشہ رہنے والا ہے، جس کی انتہاء نہیں وہ ذات نہ فناء ہوگی اور نہ ہی ختم ہوگی۔

قِـــدَم: صفت سلبیہ ہے، کیونکہ قدیم کا معنی ہے، ایسا موجود جس کی بدایت نہ ہو، قدیم اور ازل میں پھر فرق یہ ہے کہ قدیم ازل سے اخص ہے، کیونکہ قدیم کی تعریف ہے ''موجود لاأول له'' ازلی کی تعریف ہے ''مـالااول له أعم من أن يكون وجوديا كذات مولنا عزوجل او عدميا كعدمنا الأزلي.

بـــلاابتـــداء: کا مطلب ہے، کہ مسبوق بالعدم نہ ہو۔ **دائـــم**: أي بـــاقٍ.
بلاانتهاء: یعنی اس پر عدم کا طاری ہونا محال ہے، ''لانّ مـن ثبـت قِدمه امتنع عدمُه''
دائـم بلاانتهاء: سے صفت بقاء مراد ہے اور یہ بھی صفت سلبیہ ہے، کیونکہ اس کا حاصل یہ نکلا ''بـاقٍ ليس ملحوقابعدم'' اگلی عبارت ''لايفنٰی ولايبيد'' اسی صفت بقاء کی تفسیر وتاکید ہے۔ **لايـفـنٰی** (س،ض) **فـنـاءً**: معدوم ہونا۔ يـقـال: فـنٰـی الميّتُ، اذازال وذهب أثره'' یہاں معنی ہے ''أي لايزول بقاء ه''

ولايبيـد: بـاد يبيـد بيدًا وبيدُودةً: ہلاک ہونا، يـقـال بـادت القبيلة : اذاانقطعت : یہاں مراد ہے أي ''لايـنـقطع بقاؤه'' دراصل فناء اور بيد متقارب المعنی ہیں۔ جو تاکید کے لئے ہیں۔

فائدہ: ''قـديم بلاابتداءٍ، دائمٌ بلا انتهاءٍ'' کا مفہوم اللہ کے اس ارشاد میں

ہے۔﴿وهو الاوّل والاخر﴾(الحدید:۳)

یہی مفہوم مسلم شریف کی حدیث میں بھی ہے: "اللّٰهم أنت الأوّل فليس قبلك شيءٌ وأنت الآخِر فليس بعدك شيءٌ" (رقم الحدیث:۲۷۱۳)

واضح رہے کہ "قدیم" بھی "اول" کے معنی میں ہے، اگرچہ لفظ قدیم کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر قرآن وحدیث میں وارد نہیں، مگر اس کے باوجود اللہ پر اس کا اطلاق اس لئے درست ہے کہ اس کا اطلاق اجماع سے ثابت ہے اور اجماع کا حجت ہونا قرآن سے ثابت ہے۔(شرح العقائد)

لفظ موجود، واجب اور لفظ خدا کا اطلاق بھی اسی قبیل سے ہے۔

ولايكون إلا مايريد.
اور نہیں ہوتا ہے، مگر وہی جس کا اللہ ارادہ کرتا ہے۔

ارادہ کی تعریف

ولايكون: أي ولا يوجد فی ملكه إلاّ مايريد، وهذا ما اشتهر من السلف: أن ماشاء اللّٰه كان ومالم يشأ لم يكن ۔ارادہ کی تعریف یہ ہے کہ ارادہ "أحد المقدورين" کے وقوع کو ترجیح دینے والی صفت کا نام ہے مثلاً اللہ تعالیٰ حامد کو لڑکا دینے پر قادر ہے اور نہ دینے پر بھی قادر ہے، یعنی اگر چاہے تو دے اور اگر نہ چاہے تو نہ دے، تو جب لڑکا دینا اور نہ دینا دونوں اللہ کا مقدور تھا، پس جس چیز نے دینے کو، نہ دینے پر ترجیح دی، وہی ارادہ ہے اور اس کو مشیت بھی کہتے ہیں، کیونکہ ارادہ اور مشیت دونوں ایک ہی صفت ہیں، غرضیکہ جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کے ارادہ سے ہی ہوتا ہے ازل میں جو کچھ ارادہ کرلیا تھا اب اسی کے مطابق ہو رہا ہے اور دائماً اسی کے مطابق ہوتا رہے گا۔﴿فعّالٌ لمايريد﴾ (البروج) جو ارادہ کرتا ہے، کرگزرتا ہے۔تمام افعال عباد، اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے واقع ہوتے ہیں، خواہ وہ افعال ازقبیل خیر ہوں یا ازقبیل شر ہوں (کوئی چیز بھی اللہ کے ارادہ واختیار سے باہر نہیں) البتہ معتزلہ اور قدریہ کا کہنا یہ ہے کہ افعال قبیحہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے صادر نہیں ہوتے، ان کا اصول یہ ہے "إرادة القبيح قبيحٌ" ہمارا اصول یہ ہے کہ ارادہ قبیح، قبیح نہیں، بلکہ

کسب القبیح ،قبیحٌ ، نیز ارادہ رضا کو بھی مستلزم نہیں، مثلاً کافر سے کفر ہی کا ارادہ اللہ نے کیا، یعنی اللہ نے ارادہ کیا کہ فلاں سے اختیاری طور پر کفر صادر ہوگا، مگر اس فلاں کے کفر پر راضی نہیں۔

لاتبلغه الأوهام ولاتدركه الافهام.
انسانی خیالات اور اوہام اس کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے اور نہ ہی عقول انسانی اس کا ادراک کرسکتی ہیں۔

اوهام: کا مفرد **وهم** ہے، دل میں جو خطرہ گزرے اس کو وھم کہتے ہیں۔ **قال فی الصحاح: توهمت الشيء ظننته:** میں نے خیال وگمان کیا **أفهام، فهم** کی جمع ہے۔ **فهمت الشيء أي علمته:** میں سمجھ گیا، **أي لاينتهي إليه وهم ولايحيط به علمٌ** ۔مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور حقیقت سب کے تخیلات اور عقلوں سے بالاتر ہے، بندوں کا علم اس کو محیط نہیں۔ جیسے ارشاد ہے: ﴿ولایحیطون به علمًا﴾ (طہ: ۱۱۰)

وہم اور علم سے اللہ کی ذات کا احاطہ نہیں ہوسکتا، البتہ اللہ تعالیٰ کی معرفت، صفات الٰہیہ سے ہوتی ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت میں **"ترقّي من الأدنی إلی الأعلیٰ"** ہے، کیونکہ جب عقل انسانی قاصر ٹھہری، تو قوت وہمیہ اور قوت متخیلہ کا بدرجہ اولی عجز معلوم ہوگیا۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم ... و ز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر ... ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

ولا يُشبهُ الأنام.
مخلوق میں سے کوئی اس کا مشابہ نہیں۔

الأنام: أي المخلوقات ۔ وهو اسم جمع لا واحد له من لفظه ۔فرقہ **مشبهه** کے لوگ اللہ تعالیٰ کو مخلوق کے مشابہ قرار دیتے ہیں اور اس کے لئے جسم اور جہت کو ثابت کرتے ہیں ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ: مخلوق کے اجسام کی طرح اللہ تعالیٰ بھی اپنے لئے خون، گوشت اور ہڈیوں کا جسم رکھتے ہیں اور بعض نے کہا کہ: اللہ کا جسم تو ہے، مگر

مخلوق کے اجسام کی طرح خون اور گوشت سے مرکب نہیں ہے، "لایُشبہ الأنام" سے مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے فرقہ مشبہ کی تردید کی۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اورافعال میں کوئی بھی شئی اللہ کا مماثل اور مشابہ نہیں۔ "الفقہ الاکبر" میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا کلام اس سلسلے میں اور زیادہ واضح ہے، آپ فرماتے ہیں: "لایُشبہ شیئا من خلقه و لا یُشبهه شئی من خلقه" یعنی اللہ تعالیٰ کسی بھی مخلوق سے مشابہت نہیں رکھتا اور نہ ہی کوئی مخلوق اس سے مشابہت رکھتی ہے۔ آگے فرمایا: "و صفاته کلُّها خلافُ صفات المخلوقین یعلم لا کعِلمنا ویقُدر لا کقُدرتنا ویریٰ لا کرُؤیتنا" غرضیکہ صرف اسمی اشتراک تو ہے، کیونکہ انسان بھی دیکھنے سننے والا ہے، لیکن اللہ کا سننا دیکھنا ذاتی، لامحدود اور پائیدار ہے، جبکہ انسان کا ایسا نہیں۔

حیّ لایموت، قیّوم لاینام.
اللہ تعالیٰ ایسا زندہ ہے، جس کو کبھی موت نہیں آسکتی، ایسا سنبھالنے والا ہے تمام عالم کا، جس کو کبھی نیند نہیں آسکتی۔

حيٌّ: کے معنی ہیں زندہ، زندگی کی صفت اللہ کے لئے ثابت ہے دائماً، کمالات وجودیہ میں سب سے پہلے حیات ہے۔ اسماء الٰہیہ میں سے یہ لفظ لاکر یہ بتلانا مقصود ہے کہ وہ حقیقی زندگی کا مالک ہے وہ ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے والا ہے وہ موت سے بالاتر ہے۔ "وکما أن حیاته أزلیة فهي أبدیة کما نص علیها بقوله: "لایموت".

قیّومٌ: صیغہ مبالغہ۔ "قائمٌ" سے، "قیّام" بروزن فیعالٌ اور قیّوم بروزن فیعول مبالغہ کے صیغے ہیں، ان کے معنی ہیں۔ "القائم بنفسه المُقیم لغیره بالتدبیر و الحفظ" یعنی وہ جو خود قائم رہ کر دوسروں کو قائم رکھتا اور سنبھالتا ہے۔ "قیّام" سے زیادہ مبالغہ "قیّوم" کے اندر ہے، اس لئے کہ واو، الف سے اقویٰ ہے۔ "قیّوم" حق تعالیٰ کی خاص صفت ہے، جس میں کوئی مخلوق شریک نہیں ہوسکتی، اس لئے کسی انسان کو "قیّوم" کہنا جائز نہیں، جولوگ عبدالقیوم کے نام کو بگاڑ کر صرف قیوم بولتے ہیں گنہگار ہوتے ہیں۔

(معارف القرآن ج ۱/ص: ۶۱۳)

حيٌّ: سے خدا کا واجب الوجود ہونا بیان کیا، یعنی بذاتہ اور بنفسہ وہ واجب

الوجود ہے اور "قیّوم" سے خدا کا واھب الوجود ہونا بیان کیا، یعنی دوسروں کو وجود اور حیات، ہبہ اور عطا کرنے والا ہے۔

لاینام: کمال حیات اور کمال قیّومیت کی دلیل ہے، کیونکہ جس کو تعب، اونگھ اور نیند لاحق ہوتی ہے وہ پھر "غیر تام الحیات ناقص الحفظ و القیام" ہوگا۔

خالقٌ بلاحاجة رازقٌ بلامؤونَةٍ.
بغیر کسی اپنی ضرورت اور حاجت کے اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا خالق ہے وہ بغیر کسی کلفت و مشقت کے ان کا رازق ہے۔

خالق :أي لجميع خلقه بلاحاجة إليهم. رازق: أي لهم، فضلاً منه . بلامؤنةٍ :تثقله . المؤونة. خوراک، سختی بوجھ :ج مؤَن ارشاد ہے :﴿ماأُريد منهم من رزقٍ وما أُريد ان يُطعمون﴾ (الذاریات:٥٦،٥٨)﴿والله الغني وأنتم الفقراء﴾(محمد:٣٨)﴿وهو يطعم ولايُطعم﴾(الانعام:١٤)

حاصل یہ کہ حاجت، مَؤُونۃ یہ سب کمزوری اور نقص کی علامات ہیں۔ واللّٰہ تعالیٰ منزہ عنہ

مُمِيتٌ بلا مُخَافَةٍ، باعث بلا مشقَّةٍ.
(وقت مقررہ پر) وہ سب کو موت دینے والا ہے، بغیر کسی خوف کے، مرنے کے بعد دوبارہ اٹھانے والے ہیں، بغیر کسی دشواری کے۔

مُميتٌ: من الإماتة، موت دینے والا ہے۔ مُخافة :(س) خوفًا وخِيفًا ومُخافةً: گھبرانا۔ المشقة :بفتح المیم وکسرھا: دشواری، محنت ج:مشاق ومشقّات.

نوٹ: فلاسفہ موت کو "عدمی" سمجھتے ہیں، حالانکہ موت وجودی ہے۔ قال اللہ تعالیٰ:﴿الذي خلق الموت والحيوة﴾ (الملک:٢) عدمی چیز کیونکر مخلوق ہوسکتی ہے؟ پتہ چلا کہ موت وجودی ہے۔

مازال بصفاته قديمًا قبل خلقه لم يزدَدْ بكونهم شيئا لم يكن قبلهم من صفاته، وكما كان بصفاته أزليًا كذالک لايزال عليها أبديًا.
اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے قبل، اپنی صفات (صفاتِ ذات، وصفات فعل) کے ساتھ ہمیشہ سے قدیم رہا،مخلوق کے وجود کے سبب سے اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی ایسی نئی صفت کا اضافہ نہیں ہوا، جو صفت مخلوق کے وجود سے پہلے نہ ہو۔ جیسے وہ اپنی صفات میں ازلی تھا، ایسے ہی ہمیشہ انہیں صفات کے ساتھ موصوف رہے گا۔

مازال بصفاته: " مازال " افعال ناقصہ میں سے ہے۔ "قديمًا" اس کی خبر ہے۔ "من صفاته" صفات کی دو قسمیں ہیں: صفات ذات اور صفات افعال۔ صفات ذات، ان صفات کو کہتے ہیں: جن کی ذات باری تعالی سے نفی، جہل کو اور قدرت کی نفی، عجز کو مستلزم ہو اور جہل و عجز دونوں ازقبیل نقائص ہیں اور صفات افعال، ان صفات کو کہتے ہیں جن کی ذاتِ واجب سے نفی موجب نقص نہ ہو۔ مثلاً اعزاز، اذلال اور اغناء وغیرہ یہاں مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صفات کمال (صفات ذات وصفات افعال) کے ساتھ ہمیشہ سے ہے، ہمیشہ رہے گا۔ مخلوق کو پیدا کرنے کے بعد اس کے کسی وصف میں اضافہ نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ کے ثبوت میں مخلوق کا کوئی دخل نہیں ہے۔ بہرحال جیسے ذات باری تعالیٰ ازلی ابدی ہے ایسے ہی صفات باری تعالیٰ بھی ازلی اور ابدی ہیں ورنہ صفات کا ذات باری سے انفکاک لازم آئے گا۔

مازال بصفاته......: سے دراصل معتزلہ،جہمیہ اور بعض اہل تشیع وغیرہ کی تردید ہے،جن کا خیال یہ ہے کہ: "إنه تعالیٰ صار قادرًا على الفعل والكلام بعد أن لم يكن قادرا عليه لأنّه صار الفعل والكلام ممكنًا بعد أن كان ممتنعًا"

لَیْسَ مُنْذُ خَلَقَ الْخلق استفادَ اسمَ الخالق ولا بإحداثه البریّة استفاد اسمَ الباری.

مخلوق کو پیدا کرنے اور وجود میں لانے کے بعد اللہ تعالیٰ کا نام خالق نہیں پڑا (بلکہ وہ مخلوق کو وجود بخشنے سے پہلے بھی خالق تھا) اور مخلوق کو ایجاد کرنے کی وجہ سے اس نے اپنا نام ''باری'' نہیں پایا (بلکہ وہ پہلے سے بھی ''باری'' ہے)

یوں تو ''خالق'' اور ''باری'' دونوں لفظ ہم معنی ہیں، البتہ جب دونوں ایک ساتھ استعمال ہوتو ان میں فرق کیا جاسکتا ہے، چنانچہ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ: خالق کے معنی مقدّر کے ہیں، یعنی اندازہ مقرر کرنے والا اور باریٔ کے معنی ہیں محدث اور موجد کے، یعنی وجود میں لانے والا۔ (۲) قاضی بیضاویؒ کے نزدیک ''خالق'' کے معنی عام ہیں اور ''باری'' کے معنی خاص ہیں، کیونکہ ''خالق'' مطلقاً موجد کو کہتے ہیں (خواہ تفاوت ہو یا نہ ہو) اور ''باری'' بغیر کسی تفاوت وفرق کے پیدا کرنے والے کو کہتے ہیں۔ بہر حال حاصل یہ کہ ایسا نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب سے مخلوق بنائی تو خالق کا نام اسے حاصل ہوا اور نہ ہی خلقت کو پیدا کرنے سے ''باری'' اور پیدا کرنے والا نام اسے حاصل ہوا، بلکہ اللہ تعالیٰ مخلوق کو وجود میں لانے اور اسے پیدا کرنے سے پہلے بھی ''خالقیت'' اور ''باریئت'' کے ساتھ متصف تھے، کیونکہ اگر یہ صفت ازلی نہ ہوتو لازم آئے گا کہ مخلوق کی تخلیق کے بعد اللہ تعالیٰ کو صفت خالقیت حاصل ہوئی اس سے قبل گویا اللہ تعالیٰ اس کی ضد (عدم خالقیت) سے متصف تھے۔ تعالیٰ اللّٰہ عن ذلک.

له معنی الرّبوبیة ولامربوب ومعنی الخالقیّة ولامخلوق.

اللہ کے لئے ''ربوبیت'' کی صفت، یعنی پالنے کی صفت اس وقت بھی ہے، جبکہ ''مربوب'' پلنے والا موجود نہ ہو اور اس کے لئے خالقیت کی صفت اس وقت بھی ہے، جبکہ مخلوق موجود نہ ہو۔

الحاصل مربوبؔ: کے وجود سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ ''رب'' کے ساتھ موصوف

ہیں اور مخلوق کے وجود سے قبل بھی ''خالق'' کے ساتھ متصف ہیں۔

وکما أنّه مُحيي الموتٰی بعد ما أحیاهم، استحقّ هذا الاسم قبل إحيائهم، کذٰلک استحقّ اسم الخالق قبل إنشائهم. جیسا کہ وہ مردوں کو زندہ کرنے کے بعد ''محيي'' (زندہ کرنے والا) کہلاتا ہے، اسی طرح وہ زندہ کرنے سے پہلے بھی اس نام کا مستحق ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ مُردوں کو زندہ کرنے اور ان کو وجود بخشنے کے بعد ''مُحيي'' (زندہ کرنے والا) کی صفت سے موصوف ہیں، اسی طرح وہ زندہ کرنے سے قبل بھی اسی نام سے موصوف تھا۔ مثال سے اس کو اس طرح سمجھیں کہ ''کاتب'' اس کو کہتے ہیں جو لکھے، مگر جو اس وقت نہیں لکھ رہا ہے، لیکن اس میں ''کتابت'' کا ملکہ اور استعداد ہے، پھر بھی اس کو کاتب کہتے ہیں، یہی حال قاری اور مدرس کا ہے۔

ذٰلك بأنّه علی کل شيء قدیر، وکل شيء إلیه فقیر وکل أمر علیه یسیر لایحتاج إلی شيء، لیس کَمثله شيء، وهو السمیع البصیر. یہ اس لئے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے اور ہر چیز اس کی محتاج ہے، ہر کام اس کے لئے آسان ہے وہ کسی چیز کا محتاج نہیں اس کی کوئی مثال نہیں وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

ذالک :أي ثبوت صفاته في الأزل قبل خلقه۔ یہ بات عجیب سی معلوم ہو رہی تھی کہ ساری صفات باری ازلی ہیں اور مخلوق کی تخلیق سے پہلے ہی وہ ''خالق'' ہے۔ ''ذٰلک'' سے اس تعجب کو ختم کیا جا رہا ہے۔

بأنه :أي بسبب أنه علی کل شيء قدیر:

معتزلہ کا خیال یہ ہے کہ: جس چیز پر بندہ کو قدرت ہے، بعینہ اس چیز پر اللہ تعالیٰ کو قدرت نہیں، اس جملے سے ان کی تردید ہو رہی ہے، کیونکہ اہل سنت کے ہاں اللہ ہر شئی پر قادر ہے، چنانچہ ہر ممکن اللہ کا مقدور ہے۔ جہاں تک تعلق ہے محال لذاتہ کا مثلاً ''**کون الشيء الواحد موجودًا ومعدومًا في حال واحدة**'' تو وہ باتفاق عقلاء، شيء نہیں کہلاتا، لہٰذا تحت القدرت بھی داخل نہیں، ''**ومن هذا الباب خلق مثلِ نفسه**

وإعدام نفسه وأمثال ذلک من المحال..." یہاں معدوم ممکن کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ "شيء" ہے یا نہیں؟ لیکن تحقیق یہ ہے کہ: "أن المعدوم الممکن، لیس بشیء فی الخارج ولکن اللّٰہ یعلم مایکون قبل أن یکون، ویکتبه وقد یذکره ویُخبربه، فیکون شیئا في العلم والذکر والکتاب لافي الخارج"۔

ولایحتاج إلي شيء: "ویحتاج إلیه کل شيء،مثلاً ﴿إن زلزلة الساعة شيء،عظیم ﴾ اب قیامت کا زلزلہ خارج کے اعتبار سے کوئی شئی نہیں،لیکن علم الٰہی میں شئی ہے غرضیکہ اللہ تعالیٰ محتاج الیہ ہے محتاج نہیں ہے۔

لیس کمثله شيء : بظاہر اللہ کی مثل کی مثل کی نفی ہورہی ہے،حالانکہ اصلاً اللہ تعالیٰ کی مثل ہی نہیں، اس اشکال کے جواب میں اکثر کا خیال تو یہ ہے کہ (۱) کاف برائے تاکید زائد ہے والمعنی لیس مثله شيء. (۲) کاف کو زائد قرار دینا خلاف الاصل ہے، بلکہ مثل بمعنی وصف کے ہیں، أي لیس کو صفه شيء یا مثل بمعنی ذات کے ہیں أي لیس کذاته شيء.(۳) یا ظاہری معنی ہی مرادلیا جائے،مگر یہ پھر مبالغے پر محمول ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ بالفرض اگر اللہ کی مثل ہو تو اس کی بھی مثل نہیں چہ جائیکہ اللہ کی مثل ہو۔

لیس کمثله شيء : سے مشبہہ کی تردید ہوگئی، وهو السمیع البصیر : سے معطلہ کی تردید ہے۔فهو تعالیٰ موصوف بصفات الکمال، ولیس له فیها شبیهٌ فالمخلوق وإن کان یوصف بأنه سمیع بصیر، فلیس سمعه وبصره کسمع الرب وبصره. اتنی زبردست قوتِ سماعت کے باوجود اللہ تعالیٰ کانوں سے پاک ہے،اللہ تعالیٰ ہر چیز کو دیکھتا ہے،لیکن وہ مخلوق جیسی آنکھوں سے پاک ہے۔

> **خلق الخَلْقَ بِعِلْمِهِ وقدَّر لهم أقْدارا وضرب لهم آجالا.**
>
> اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اس حال میں پیدا کیا کہ اللہ کو مخلوق کا علم تھا اور اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی تقدیریں مقرر کیں، اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے لئے موتیں (آخری وقت) مقرر کیں۔

خلق: أي أوجد وأنشأ وأبدع الخلق: أي المخلوق بعلمه: في سابقته وقوله: "بعلمه" في محل نصب على الحال، أي خلقهم عالمًا بهم۔ فمن أثبت العلم، فقد نفى الجهل، ومن نفى الجهل لم يثبت العلم.

غرض یہ کہ اللہ کے لئے صفت علم کا اثبات ضروری ہے۔ یہ نہیں کہنا چاہئے کہ "والله لايجهل" کیونکہ جہالت کی نفی علم کے لئے مستلزم نہیں، البتہ اثبات علم نفی جہالت کو مستلزم ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اپنے علم سے پیدا کیا، کیونکہ جہل کے ہوتے ہوئے ایجاد الاشیاء محال ہے۔

وقدّرلهم أقدارا من خير أو شر۔ "أقدارا" قَدَّر کا مفعول بہ ہے، مفعول مطلق نہیں، کیونکہ یہ مصدر نہیں، بلکہ "قدَر" کی جمع ہے۔

تقدیر کی تعریف: "وهو تعيين كل مخلوق بمرتبته التي توجد من حسن وقبح ونفع وضرر ومايحيط به من مكان وزمان، ومايترتب عليه من ثواب أو عقاب". (شرح الفقه الأكبر)

قال تعالىٰ: ﴿وخلق كلَّ شيء فقدَّره تقديرا﴾ (الفرقان:۲)

"وفي صحيح مسلم عن عبدالله بن عمر رضي الله عنهما، عن النبي ﷺ أنه قال: "كتب الله مقادير الخلق قبل أن يخلق السماوات والأرض بخمسين ألف سنةٍ وَكَانَ عَرْشُه على الماء" أخرجه مسلم في صحيحه، رقم (۲٦٥۳) كتاب القدر".

حاصل یہ ہے کہ ہر مخلوق کو جن صفات کے ساتھ جس زمان و مکان میں موجود ہونا ہے، وہ سب ازل میں پہلے سے متعین کر دینے کا نام تقدیر ہے۔ تقدیر کا یہ مسئلہ اسلام کا قطعی عقیدہ ہے، اس کا منکر کافر ہے۔

وضرب لهم آجالا:

یعنی خلائق کی ایک مدت اور میعاد اللہ کے علم میں مقرر ہے۔ جب میعاد پوری ہو کر اس کا وقت پہنچ جائیگا، ایک سیکنڈ تقدیم و تاخیر کی گنجائش نہیں ہوگی۔ "آجال": اجل کی

جمع ہے ''میعاداور وقت مقررہ'' کو کہتے ہیں۔

لم يخفَ عليه شيءٌ قَبلَ أنْ خلقهم وعلِم ماهم عاملون قبل أن يخلقَهم.

مخلوق کی پیدائش سے پہلے بھی اللہ سے مخلوق کا کوئی فعل پوشیدہ نہیں، ان کے ان اعمال سے باخبر تھا، جو وہ کرنے والے ہیں۔

اس میں روافض اور قدریہ کی تردید ہو رہی ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ کو کسی چیز کی تخلیق وایجاد سے قبل اس کا علم نہیں، پیدا کرنے اور موجود کرنے کے بعد اس کو جانتا ہے، یہاں فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ ''ماکان'' ''مایکون'' سب جانتا ہے، مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے بھی اللہ ان کی پوری واقفیت رکھتا ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال کا بھی خالق ہے لہٰذا وہ بندوں کی تخلیق سے قبل ان کاموں کو جانتا ہے جن کو بندے کریں گے۔ الغرض قبل از وقوعِ حوادث، ہر ایک چیز سے فرداً فرداً اور تفصیلاً اللہ تعالیٰ کا علم محیط اور ازلی، متعلق اور وابستہ ہے، نہ یہ کہ وقوع کے بعد ان سے اللہ تعالیٰ کا علم وابستہ ہوتا ہے، جیسا کہ روافض اور قدریہ کا خیال ہے۔

(نوٹ) قدری فرقہ (منکرین تقدیر) معتزلہ ہی کی ایک شاخ ہے۔ (شرح مواقف: طبع لکھنؤ ر ۷۴۷)

وأمرهم بطاعته ونهاهم عن معصيته.

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اپنی فرمانبرداری کا حکم دیا ہے اور لوگوں کو اپنی نافرمانی سے روکا ہے۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے خلق اور قدر کے بعد امر و نہی کا ذکر کر کے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اپنی عبادت کی خاطر پیدا فرمایا ہے اور ان کو مکلف بنایا ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وماخلقت الجن والإنس إلّاليعبدون﴾ (الذاريات: ٥٦)

گویا پچھلی عبارت میں ''خلق'' اور اس عبارت میں ''أمر'' کا ذکر ہے۔ خلق اور

امر دونوں کا ذکر آیت ﴿ألاله الخلق و الأمر﴾ (الاعراف: ٥٤) میں بھی ہے۔

وكل شيءٍ يجري بتقديره ومشيئته ، ومشيئته تنفُذ، لامشيئة للعباد إلَّاماشاء لهم،فما شاء لهم كان، ومالم يشألم يكن.

کائنات کی ہر شئی اس کی تقدیر اور اس کے ارادے کے مطابق جاری ہے اور اسی کی چاہت چلتی ہے، بندوں کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا، مگر جو ان کے لئے اللہ نے چاہا، تو اللہ نے جو ان کے لئے چاہا وہ ہوا اور جو نہیں چاہا وہ نہیں ہوا۔

فما شاء لهم كان :أي وُجد وما لم يشأ لهم لم يكن أي لم يوجد. وفي هذا رد على المعتزلة القائلين: إنما يريد الله من أفعال العباد ماكان طاعة والمعاصي والقبائح واقعة بإرادة العبد على خلاف إرادة الله تعالىٰ. وقد قال تعالىٰ:﴿ وماتشاء ون الا أن يشاء اللّٰه﴾ (الدھر: ۳۰)

وهم قد شاؤا المعاصي؛ فكانت بمشيئة اللّٰه تعالىٰ بهذا النص.

(شرح عیقدہ الطحاویہ للمیدانی)

ومن أضل سبيلاً واكفر ممن يزعم أن اللّٰه شاء الإيمان من الكافر والكافر شاء الكفر فغلبت مشيئة الكافر مشيئة اللّٰه، تعالىٰ اللّٰه عما يقولون علوًا كبيرًا.

حاصل یہ ہے کہ افعال عباد (از قسم طاعات ومعصیات ہر دونوں) اللہ ہی کے ارادے سے واقع ہوتے ہیں، اس میں معتزلہ کی تردید ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ: افعال قبیحہ، اللہ کے ارادے سے صادر نہیں ہوتے، بلکہ بندوں کے اچھے افعال اللہ کے ارادے سے صادر ہوتے ہیں۔ ہاں! اتنی بات ضرور ہے کہ اللہ کی مشیت وارادہ، اللہ کی رضاء کو مستلزم نہیں۔ کافر کا کفر بھی تقدیر الٰہی کے مطابق ہے اور اس کی مشیت وارادہ کے ماتحت ہے، مگر اس کے ساتھ رضاء الٰہی وابستہ نہیں، کما قال تعالیٰ ﴿ولا یرضیٰ لعبادہ الکفر﴾ (الزمر: ۷) کیونکہ ایجاد کفر وشر اور کسی کے کفر کا ارادہ کرنا، اس کو مستلزم نہیں کہ اس شر اور معصیت کا ارتکاب بھی پسندیدہ ہو۔ اہل سنت کہتے ہیں: نہ خلقِ قبیح، قبیح ہے اور نہ ارادۂ قبیح، قبیح ہے،

بلکہ کسبِ قبیح، قبیح ہے اور قبیح (مثلاً کفر ومعصیت) کے ساتھ متصف ہونا قبیح ہے، جو بندہ کا فعل اختیاری ہے مثلاً تلوار چلانے والے ہی کو قاتل کہا جاتا ہے، تلوار بنانے والے اور بنانے کا ارادہ کرنے والے کو نہ کوئی قاتل کہتا ہے اور نہ ظالم، تلوار کا بنانا اور اس کا ارادہ کرنا، تو کمال ہی کمال ہے، لیکن اگر اس کا استعمال بے محل ہے، تو وہ بلاشبہ معیوب اور مذموم ہے۔ (علم الکلام:۹۶)

> **يهدي من يشاء ويعصم ويُعافي فضلاً ويضل من يشاء ويخذُل ويبتلي عدلاً .**
>
> اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے جس کو چاہے بھلائی کی ہدایت دیتا ہے، جس کی چاہے حفاظت کرتا ہے اور جس کو چاہے عافیت دیتا ہے، اور وہ عدل وانصاف کی بناء پر جسے چاہے گمراہ کرے اور بے یار ومددگار چھوڑ دے اور مصیبت میں مبتلا کر کے آزمائے۔

اس عبارت میں بھی معتزلہ کی تردید ہے، معتزلہ کا خیال ہے کہ: "**أصلح للعباد**" یعنی بندہ کے حق میں جو انفع اور انسب ہو، اللہ تعالیٰ پر واجب ہے، جبکہ اہل سنت کے ہاں ایسا کرنا اللہ پر واجب نہیں، اگر اللہ بندوں کو ہدایت دے اور ان کی حفاظت کرے تو یہ محض اس کا فضل ہے اور اگر اس کے برعکس ہو تو یہ اس کا عدل ہے۔

معتزلہ کے ہاں ایک فاسد اصول یہ ہے کہ "**أنَّ أفعال العباد مخلوقة لهم**" اس وجہ سے معتزلہ ہدایت اور اضلال کی تفسیر دوسری طرح کرتے ہیں، ان کے ہاں ہدایت کے معنی، راہ حق کا بیان کرنا ہے۔ اضلال کے معنی "**وجدان العبد ضالاً**"، یا "**تسمية العبد ضالاً**" کے ہیں، یعنی بندہ کو ضال پانا یا اس بندہ کا ضال نام رکھنا ہے، جبکہ اشاعرہ ہدایت کے معنی خلق طاعت اور خلق اہتداء، یعنی بندہ کے اندر طاعت پیدا کر دینا، اور بندہ کو راہ راست پر چلا دینا، بیان کرتے ہیں، اور اضلال کے معنی خلق ضلالت اور خلق معصیت بیان کرتے ہیں۔

تعریفِ عصمت: "**وهي ملكة تحمل صاحبها على اجتناب المعاصي مع التمكن منها.**" (التعریفات)

عافية: " وهي دفاع الله تعالٰی عن العبد." (مختار الصحاح)

يخذل: "بضم الذال يترک نصرته وعونَه."

وكلهم يتقلّبون في مشيئته بين فضله وعدله.

تمام لوگ اللہ تعالیٰ کی چاہت اور مشیت کے مطابق اس کے فضل وکرم اور عدل وانصاف کے درمیان چلتے پھرتے ہیں اور زندگی گزارتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ کی مرضی کے مطابق، اللہ کے فضل اور عدل کے درمیان تمام لوگوں کی الٹ پھیر ہے، جس کو اللہ نیکی اور ایمان کی دولت نصیب فرمائیں، تو یہ اس کا فضل ہے اور جس کو اللہ گمراہ کرڈالے تو یہ اس کا عدل ہے۔ کافروں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ یہ سوال کرسکیں کہ ہم کو ایسا کیوں بنادیا؟ اور ہم کو کیوں دوزخ میں ڈالا جاتا ہے؟ کیونکہ مالک کو اختیار ہے، جس شخص کو چاہے کافر بنائے، جس کو چاہے مؤمن بنائے۔ حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام کام فضل اور عدل میں منحصر ہیں، دعاء میں ہمیشہ فضل کی طلب ہونی چاہیے، عدل کی نہیں، کیونکہ قیامت کے دن اگر اللہ تعالیٰ عدل محض شروع کردے، پھر تو جنت میں جانا مشکل ہوجائے گا۔

وهو متعالٍ عن الأضداد والأنداد.

وہ ذات ہمسروں اور شرکاء سے بالاتر ہے۔

الضد: المخالف. النّد: المثل.

کوئی بھی اللہ کی مخالفت نہیں کرسکتا، اللہ جو چاہے بلاروک ٹوک سے کرگزرتے ہیں، اللہ کی مثل بھی نہیں۔ کما قال تعالیٰ: ﴿ولم يكن له كفوا أحد﴾ معتزلہ کا خیال ہے کہ: بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے۔ "ضد اور ند" کی نفی کرکے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے معتزلہ کی تردید کی کہ خالق افعال العبد بھی اللہ ہی ہے، ورنہ اللہ اور بندہ کے درمیان خلق میں شرکت لازم آئے گی ایسے ہی جب بندہ اپنے افعال کا خالق ہوگا تو بندہ کچھ کرے گا اور اللہ کا ارادہ کچھ اور ہوگا اس طرح بندہ اللہ

کا مخالف ہو جائے گا۔

> **لارادَّ لقضائه ولامُعقِب لِحُكْمِهِ ولاغالب لِأَمره.**
>
> اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا کوئی ٹالنے والا نہیں اور اللہ کے حکم کو کوئی مؤخر کرنے والا نہیں اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے امر اور حکم پر کوئی غالب ہونے والا ہے۔

أي لايردُّ قضاء الله رادٌ ولا يوخِر حكمه مؤخِرٌ ولا يغلب أمره غالبٌ. معقّب: يقال: عقّب الحاكم على حكم من كان قبله إذا حكم بعد حكمه بخلافه.

الحاصل اللہ کا تکوینی حکم وفیصلہ اٹل ہے۔ کوئی طاقت اس کو ٹال سکتی ہے، نہ مؤخر کرسکتی ہے اور نہ ہی اللہ کے امر اور حکم پر کوئی غلبہ کرسکتا ہے۔

> **آمنّا بذالک کلِّه وأيقنّا أنَّ كلًّا من عنده.**
>
> ہم ان سب باتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمارا یقین ہے کہ سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

بذلک :أي القضاء المقدور. كلّه :خيره وشرّه، حلوه ومُرّه.

الإيقان : الاستقرار، من يقن الماء في الحوض :إذا استقر كلاً. اس میں تنوین مضاف الیہ کے عوض ہے **أي كل كائن محدث من عند الله. أي :بمشيته وإرادته.**

رسالت

> **وإنّ محمّدًا ﷺ عبده المصطفٰى ونبيُّه المجتبىٰ ورسوله المرتضٰى.**
>
> بلاشبہ حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے اور اس کے چنے ہوئے نبی اور اس کے پسندیدہ رسول ہیں۔

وإنّ محمدًا :"إِنّ" بکسرہ الہمزۃ ہے اور **"إنّ الله واحدٌ لاشريك له"** پر عطف ہے اور یہ سب "نقول" کے معمول ہیں۔" **أي نقول في توحيد الله إن الله واحد لاشريك له ونقول إنّ محمدًا..." "الاصطفاء والاجتباء**

والارتضاء" متقارب المعنی ہیں۔ محمدا: "هو علم منقولٌ من اسم مفعول المضاعف، فيسمى بذلك لكثرة خصاله الحميدة أو لأنه يُحمد في السماء والأرض ولم يسم به أحد قبله." (شارح،میدانی) "محمّد" میں مبالغہ محمود سے زیادہ ہے۔

عبده: قدّمه على الرسالة امتثالاً لقوله ﷺ كما في الحديث الصحيح: "ولا تُطروني كما أطرت النصارىٰ عيسى بنَ مريم و إنما أنا عبده ورسوله فقولوا عبد الله ورسوله" (رواہ البخاری عن عمر)

ولأنه أحب الأسماء إلى الله تعالىٰ وذكر الله نبيه ﷺ: باسم العبد في أشرف المقامات فقال: ﴿سبحان الذي أسرىٰ بعبده﴾ (الاسراء) إلى غير ذلك من الآيات. نبيه: من النبوة وهي الرّفعة، أي إن له عند الله رُتبة شريفة ومكانة منيفة أو من النبأ بالهمزة و قد تسهل، وهو الخبر: أي يكون النبيّ مخبرًا عما بعثه الله تعالىٰ به ومُنبئاً بما أطلعه الله تعالىٰ عليه۔

رسول کی تعریف:" إنسان بعثه الله تعالىٰ إلى الخلق لتبليغ الأحكام.

(شرح عقائد)

نبی اور رسول میں فرق

رسول وہ ہے جسے نئی شریعت کی تبلیغ کے لئے بھیجا گیا ہو، بخلاف نبی کے، کہ وہ عام ہے جسے نئی شریعت کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہو، وہ بھی نبی ہے اور جسے لوگوں کو شریعت سابقہ پر قائم رکھنے کے لئے بھیجا گیا ہو، وہ بھی نبی ہے، لہٰذا نبی عام ہے اور رسول خاص ہے۔

(بیان الفوائد)

خاتم الأنبياء وإمام الأتقياء وسيد المرسلين وحبيب رب العالمين.

اور آپ ﷺ آخری نبی سب متقیوں کے پیشوا اور سب رسولوں کے سردار اور اللہ رب العالمین کے محبوب ہیں۔

آپ ﷺ خاتم الانبیاء ہیں، آپ ﷺ کے بعد قیامت تک کوئی نیا نبی پیدا نہیں ہوگا اور کوئی بھی نیا نبی نہیں آئے گا، ہاں عیسیٰ علیہ السلام جو کہ سابق انبیاء میں سے ہیں اور پہلے سے نبی بنائے جا چکے ہیں، وہ آسمان سے نزول فرما کر تشریف لائیں گے، لیکن اب کہ مرتبہ جب عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے، تو آپ کی نبوت موقوف ہوگی مسلوب نہیں ہوگی، کیونکہ نبی اور رسول منصب نبوت ورسالت سے کبھی بھی معزول نہیں کیئے جاتے ہیں، ان کی تخلیق بحیثیت نبی ہوتی ہے، نبی وفات کے بعد بھی نبی ہوتا ہے لیکن عیسیٰ علیہ السلام شریعت محمدی کے متبع اور داعی ہوں گے۔ بہرحال اہل اسلام آپ ﷺ خاتم النبین کے بعد کسی بھی شخص کے لئے نبوت کی کسی بھی قسم (ظلی، بروزی اور غیر تشریعی) کے قائل نہیں۔ختم نبوت کے عقیدہ پر قرآن کریم کی سو آیات، دوسو احادیث دلالت کرتی ہیں، اجماع امت اس پر مستزاد ہے، احادیثِ ختم نبوت حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "ختم نبوت کامل" مصنفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ۔

الإمام: الإمام الذي يؤتَمُّ به أي:يقتدون به. **الأتقياء**: جمع تقيّ وهو من اتصف بالتقوىٰ، قال البيضاوي:التقوىٰ في عرف الشرع اسم لمن يَقيْ نفسه عما يضره في الآخرة، وكل من اتبع الرسول، واقتدى به،فهو من الاتقياء.وسيد المرسلين: أي سيد جميع المرسلين، قال ﷺ:أنا سيّد ولد آدم، ولا فخر. (ترمذی:۳۶۱۸)

یہاں یہ اشکال پیش آسکتا ہے کہ جب آپ ﷺ انبیاء کے سردار ہیں اور انبیاء سے افضل ہیں، حالانکہ حدیث میں رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "لاتفضّلوا بين الأنبياء." (بخاری ۳۴۱۴)

ایسے ہی فرمایا: "لاتفضّلوني على موسىٰ." (بخاری:۲۴۱۱) اور فرمایا: "لاينبغي لعبدٍ أن يقول أنا خير من يونس بن متّى." ان احادیث میں بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دینے کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔

جواب یہ ہے کہ: قرآن وحدیث کی کسی دلیل سے اگر بعض انبیاء کی بعض پر

فضیلت معلوم ہوگئی، تو اس کے مطابق اعتقاد رکھا جائے، رہی حدیث "لاتفضّلوا بين الأنبياء" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ: دلیل کے بغیر اپنی رائے سے بعض کو بعض پر فضیلت نہ دو، رہا آپ کا یہ ارشاد "لاينبغي لعبدٍ ..." تو یہ اس وقت سے متعلق ہے، جب کہ آپ کو یہ علم نہیں دیا گیا تھا کہ آپ تمام انبیاء سے افضل ہیں، بعد میں بذریعہ وحی آپ ﷺ کو یہ بات بتلادی گئی اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے آپ ﷺ نے اس کا اظہار بھی فرمادیا۔ (مظہری)۔حبیب: فعيل بمعنى مفعول أي محبوبٌ.

وكُلُّ دَعْوةِ نَبوّةٍ بعدَهُ فغيّ وهوىٰ.

آپ ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ گمراہی اور خواہش پرستی ہے۔

الغيّ: ضد الرشاد- الهوىٰ: عبارة عن شهوة النّفس.

اس سے قبل آپ ﷺ کا خاتم النبیین ہونا جب معلوم ہوا تو اب فرمایا کہ: آپ ﷺ کے بعد کوئی بھی کسی بھی قسم کی نبوت کا دعوی کرے گا، تو وہ جھوٹا ہوگا اور اس کا یہ دعویٰ خواہش پرستی کی علامت قرار دیا جائے گا، اس کی کوئی دلیل اور کوئی تاویل قبول نہ ہوگی اور نہ ہی اس سے دلیل طلب کی جائے گی جیسے مسیلمہ کذّاب سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کوئی دلیل نہیں مانگی، بلکہ اس سے قتال کیا۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: "إنّه سيكون في أمتي كذّابون ثلاثون كلُّهم يزعم أنّه نبي وأنا خاتم النبيين لانبيَّ بعدي." (ابوداؤد: ۲/ ۲۲٤)

یعنی میری امت میں تیس جھوٹے پیدا ہوں گے، ہر ایک یہی کہے گا کہ میں نبی ہوں، حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں۔ (میرے بعد کوئی کسی قسم کا نبی نہیں ہوسکتا)

یہاں اشکال ہوسکتا ہے کہ: آنحضرت ﷺ کے بعد سے آج تک بے شمار لوگ نبوت کا دعویٰ کر چکے، حالانکہ اس حدیث میں صرف تیس کے بارے میں پیشین گوئی کی گئی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ: اس حدیث میں جن تیس دجالوں کا ذکر ہے وہ وہی ہیں جن کی شوکت قائم ہوجائے، متبع زیادہ ہوں اور ان کا مذہب چلے، ماضی قریب میں اس کا مصداق

مرزا غلام احمد قادیانی ہے۔

اشکال: قرآن مجید اور احادیث میں آپ ﷺ کو "خاتم النبیین" کہا ہے نہ کہ خاتم الرسول، لہٰذا ہوسکتا ہے آپ ﷺ کے بعد کوئی رسول آئے۔ جواب: رسول خاص ہے اور نبی عام ہے "وانتفاء العام یستلزم انتفاء الخاص" اور جو حضرات ان دونوں (رسول اور نبی) میں تساوی کی نسبت مانتے ہیں، ان کے قول کے مطابق تو کوئی اشکال ہی نہیں۔

> **وهو المبعوث إلى عامّة الجن و كافّة الورىٰ المبعوث بالحق والهُدىٰ.**
>
> آپ ﷺ تمام جن اور تمام مخلوق کی طرف مبعوث ہیں، آپ علیہ السلام رب کی طرف سے حق کی روشنی کے ساتھ مبعوث ہیں اور اللہ کے حکم سے آپ ہدایت کے نور کے ساتھ بھیجے گئے ہیں۔

آپ ﷺ کی بعثت عام ہے، آپ علیہ السلام ثقلین (جن وانس) کی طرف مبعوث ہیں، عامۃ الجن کی طرف مبعوث ہونے کی دلیل ایک تو جنات کا یہ قول ہے۔ ﴿یٰقومنا أجیبوا داعي الله﴾ (الاحقاف:۳۱) اے ہماری قوم! اس کی بات مانو جو اللہ کی طرف بلا رہا ہے۔ اس کے علاوہ سورۃ الجن بھی اس پر دلالت کرتی ہے، چنانچہ حضور ﷺ کے وقت بہت بڑی تعداد میں جن مسلمان ہوئے اور حضور سے ملاقات کرنے اور دین سیکھنے کے لئے ان کے وفود حاضر خدمت ہوئے، خفاجیؒ نے روایات کی بنیاد پر دعویٰ کیا ہے کہ چھ مرتبہ آپ ﷺ نے جنات سے ملاقات کی ہے۔ (فوائد عثمانیہ ص ۶۷۲)

و كافّة الورىٰ :أي الخلق فهو من عطف العام على الخاص، وإنما ابتدأ بالجن اقتداءً بقوله تعالىٰ ﴿وما خلقت الجن والإنس إلّا ليعبدون﴾ وقدمت في هذه الاية و نحوها لكون الجن سبقوا في الوجود قال تعالىٰ: ﴿والجان خلقناه من قبل من نار السموم﴾ (الحجر:۲۷)

بہرحال آپ کی بعثت تمام دنیا کے لوگوں کو عام ہے، عرب کے اُمیین یا یہود

ونصاریٰ تک محدود نہیں۔جیسے ارشاد ہے: ﴿قل يا أيها الناس إني رسول الله إليكم جميعاً﴾ (الاعراف:۱۵۸) اپنی خصوصیات میں ایک خصوصیت حضور ﷺ نے یہ بیان فرمائی ہے: ﴿وأُرسلت إلى الخلق كافة وخُتم بي النبيّون" (الاعراف:۱۵۸)

قرآن مجید

وإنّ القرآن كلام الله، منه بَدَا بلا كيفيّةٍ قولاً، وأنزَلَهُ على نبيّه وحيًا، وصدّقه المؤمنون على ذلك حقًا، وأيقنوا أنّه كلام الله تعالىٰ بالحقيقة ليس بمخلوق ككلام البريّة.

بے شک قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اس کی ذات سے باعتبار قول بغیر کسی کیفیت کے یہ کلام ظاہر ہوا، اور اس کو اپنے رسول کریم ﷺ پر وحی کی صورت میں اتارا، اہل ایمان نے حق سمجھتے ہوئے اس کی تصدیق کی اور انہوں نے اس بات کا یقین کیا کہ حقیقۃً یہ اللہ کا کلام ہے، مخلوق کے کلام کی طرح مخلوق نہیں۔

وإنّ القرآن : یہ عبارت "إنّ الله تعالىٰ واحد" پر عطف ہو کر "نقول" کا مقولہ ہے۔ أي ونقول إنّ القرآن ... منه بدا: أي لامن بعض المخلوقات. اس کی ذات سے کلام ظاہر ہوا، أي هو المتكلم به. اس سے مقصود معتزلہ وغیرہ کی تردید ہے جن کا خیال یہ ہے کہ کلام اللہ، اللہ کی ذات سے ظاہر نہیں ہوا، بلکہ یہ اللہ کی مخلوق اور اللہ کی ذات سے الگ ہے، ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ نے کلام کی تخلیق ایک محل میں کی، اس کے بعد اسی محل سے کلام کا ظہور ہوا، ان سے یہ بھی منقول ہے کہ: قرآن بطریق تخیل حضرت جبرئیل علیہ السلام کے قلب پر وارد ہوا، پھر انہوں نے اس کو اپنی زبان سے تعبیر کیا۔ قولاً : کہہ کر: اس سے معتزلہ کے خیال کی تردید کردی گئی۔ بلا كيفية : جار مجرور "قولاً" سے حال واقع ہے۔ أي مقولاً بلا كيفية، یعنی حرف، آواز اور ظہور کی کیفیت کے بغیر یہ کلام (قرآن مجید) اللہ کی ذات سے باعتبار قول ظاہر ہوا۔

وحيًا : أي بواسطة الوحي. على ذلك : الاشارة إلى ماذكره من التكلم به على الوجه المذكور وإنزاله۔ أنه : أي القرآن والمراد به المقروء.

تمام اہل سنت (مذاہب اربعہ وغیرہ سلف وخلف) اس پر متفق ہیں کہ قرآن کریم

اللہ کا کلام اور غیر مخلوق ہے۔

فمن سمعه فزعم أنه كلام البشر فقد كفر، وقد ذمّه اللّٰه، وعابه، وأوعده بسقر حيث قال تعالٰى: ﴿سأصليه سقر﴾ (المدثر: ۲۶)
فلمّا أوعد اللّٰه بسقر لمن قال: ﴿إن هذا إلاقول البشر﴾ (المدثر: ۲۵)
علمنا وأيقنًا أنه قول خالق البشر ولا يُشبه قولَ البشر.

جس نے اس کو سن کر یہ گمان کیا کہ یہ انسان کا کلام ہے، تو اس نے کفر کیا، بیشک اللہ تعالیٰ نے ایسے انسان کی مذمت بیان فرمائی اور اس کا عیب بیان کیا اور اسے جہنم کی دھمکی دی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''میں عنقریب جہنم میں داخل کروں گا'' تو جب اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو جہنم کی وعید سنائی ہے جس نے یہ کہا: ''یہ قرآن تو ایک انسان کا کلام ہے'' تو ہم نے اس حقیقت کو جان لیا اور یقین کرلیا کہ یہ کائنات کے پیدا کرنے والے ''رب العالمین'' کا کلام ہے اور یہ انسان کے کلام جیسا نہیں۔

جس نے قرآن کے کلام اللہ ہونے سے انکار کیا، بلاشبہ وہ کافر ہے، کیونکہ قرآن اللہ کا کلام اور اس کی صفتِ قدیم ہے اور جس نے اللہ کی صفت قدیم کی نسبت مخلوق کی طرف کردی تو وہ مفتری اور کافر ہے۔

ولا يشبه قول البشر: یعنی قرآن، کلام اللہ، جو اللہ کی صفت ہے، یہ بشر کے قول سے کوئی مشابہت نہیں رکھتا، کیونکہ قرآن اشرف، افصح اور اصدق ہے، قرآن جیسا کلام پیش کرنا انسانی طاقت اور بساط سے باہر ہے۔

صفات باری تعالیٰ

ومن وصَّف اللّٰهَ بمعنى من معاني البشر، فقد كفر، فمن أبصر هٰذا اعتبر، وعن مثل قول الكفار انزجر، وعلِم أن اللّٰه بصفاته ليس كالبشر.

جو اللہ تعالیٰ کے لئے انسانی صفات میں سے کوئی صفت ثابت کرے، تو بلاشبہ اس نے کفر کیا، البتہ جس نے اس کو بصیرت کی نگاہ سے دیکھا اسے نصیحت حاصل ہوئی اور کفار کے قول کی مشابہت سے رک گیا اور اسے اس بات کا علم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات میں بشر کی طرح نہیں۔

یہ "نـفـي التشبيه عقيب ا لإ ثبات " ہے،یعنی پہلے ذکر ہوا کہ قرآن درحقیقت کلام اللہ ہے، اللہ کی ذات سے ظاہر ہوا، تکلم کے ساتھ موصوف ہونے کی وجہ سے اللہ متکلم ہے، انسان کی طرح اللہ متکلم نہیں ہے، کیونکہ صفات الٰہیہ بشر کی صفات کے مانند نہیں ہیں۔

قـولـه:فـمن أبصر هذا اعتبر : جس نے بصیرت کے ساتھ اس سلسلے (اثبات الوصف ونفی التشبیہ) میں غور کرلیا وہ متنبہ ہو جائے گا اور کفار کی طرح بات کرنے سے رُک جائے گا۔

رؤیت باری تعالیٰ

والـرُّؤية حقٌ لأهـل الـجـنة بـغيـر إحـاطة و لا كيـفيّة ، كما نطَق بـه ربّنا﴿وجوه يومئذٍ ناضرة إلٰى ربها ناظرة﴾ (القیامۃ:۲۲،۲۳)

وتفسيره على ما أراد اللّٰه تعالىٰ وعَلِمهَ، وكُلُّ ماجاء في ذٰلک من الحديث الصحيح عن رسول اللّٰه ﷺ، وعن أصحابه رضوان اللّٰه عليهم أجـمـعين فهو كما قال، ومعناه على ما أراد، لاندخل في ذلک متأوّلين بـآراء نـا ولا متـوهِّـمـيـن بـأهـوائـنـا، فـإنه ماسلم في دينه إلاّ من سلَّم للّٰه عزوجل ولرسوله ﷺ وردَّ علم ما أشتبه عليه إلٰى عالمه.

اہل جنت کی رؤیت (دیدارالٰہی)باری تعالیٰ برحق ہے، بغیر کسی احاطے اور کیفیت کے، جیسا کہ ہمارے پروردگار کی کتاب نے بیان کیا (بہت سے چہرے اس دن نکھرے ہوئے اپنے رب کو دیکھ رہے ہوں گے)اس کی تفسیر وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی مراد اور اس کے علم میں ہے اور اس سلسلے میں جو احادیث صحیحہ آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے منقول ہیں تو وہ بھی اسی مطلب ومفہوم میں ہوں گے جو آپ کی مراد ہے، ہم اس میں تاویل کر کے اپنی آراء اور تو ہم سے اپنے خیالات داخل کرنا نہیں چاہتے ،اس لئے کہ دین میں وہی سلامت رہا جس نے اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کے لئے تسلیم وانقیاد اختیار کیا اور مشتبہ علوم کا علم اس کے جاننے والے کے سپرد کردیا۔

لأهل الجنة :تخصيص أهل الجنة بالذكر يفهم منه نفي الرؤية عن غيرهم.

بـغيـر إحاطة و لا كيفية: یعنی آخرت میں اہل ایمان، اللہ کو دیکھیں گے، مگر

اس کا احاطہ پھر بھی نہیں کر سکیں گے، یعنی مرئی (اللہ تعالیٰ) کے تمام حدود واطراف کا احاطہ نہیں کر سکیں گے، اس طرح یہ رؤیت بغیر جہت اور کیفیت کی ہوگی۔

جہمیہ، معتزلہ، خوارج اور امامیہ، رؤیت باری تعالیٰ کے منکر اور مخالف ہیں، جبکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین اور دین کے تمام بڑے مقتدا (اہل سنت والجماعت) رؤیت باری تعالیٰ کو برحق سمجھتے ہیں، قرآن کریم اور احادیث متواترہ سے یقینی طور پر معلوم ہو چکا ہے کہ آخرت میں دیدار الٰہی کا شرف حاصل ہوگا۔ (دنیا میں کوئی اللہ کو نہیں دیکھ سکتا، کیونکہ دنیا کی انسانی آنکھوں میں وہ طاقت نہیں جو اللہ کا دیدار کر سکے، لیکن یہاں یہ بات واضح رہے کہ دنیا میں رؤیت الٰہی محال عادی وشرعی ہے۔ محال عقلی نہیں، کیونکہ محال عقلی کا وجود کسی جگہ نہیں ہوتا، حالانکہ حق تعالیٰ کا دیدار آخرت میں ہوگا۔ اور دنیا میں بھی وجہ استحالہ رؤیت، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں، بلکہ ہماری طرف سے ہے ہم اس کے متحمل نہیں ورنہ حق تعالیٰ میں خفاء نہیں وہ تو یہاں بھی ظاہر ہے اگر آفتاب چمک رہا ہے اور کوئی شخص آنکھ پر ہاتھ رکھ کر دیکھے تو مانع اس شخص کی طرف سے ہوگا آفتاب کو مخفی نہ کہا جائے گا۔

نوٹ: فرشتوں سے بھی اللہ تعالیٰ کا کلام بالمشافہ نہیں ہوتا، جیسا کہ ترمذی کی روایت میں جبریل علیہ السلام سے منقول ہے کہ میں بہت قریب ہو گیا تھا اور پھر بھی ستر ہزار حجاب رہ گئے تھے۔ (معارف القرآن: ۷/۱۶۷)

شب معراج میں اللہ کے رسول نے اللہ کو دیکھا ہے یا نہیں، اس میں چونکہ صحابہ وتابعین کا اختلاف ہے۔ اس لئے علماء میں بھی اختلاف ہے جو علماء رؤیت کے قائل ہیں، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قاعدہ سے کہ دنیا میں رؤیت محال عادی ہے، مستثنیٰ کیا ہے، کیونکہ دلیل سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیکھنا ثابت ہوتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ: دنیا میں استحالۂ رؤیت کی علت رائی کی عدم قابلیت تھی ورنہ مرئی میں تو کوئی مانع ہی نہیں۔ دیگر علماء عدم رؤیت کے قائل ہیں اور عدم رؤیت راجح ہے) دنیا میں انسان کی قوتِ بینائی کا ضعف ہی انسان کے لئے زیارت حق کے درمیان حجاب ہوتا ہے، اس لئے جنت میں جبکہ اس کی بینائی قوی کر دی جائیگی تو وہاں ہر جنتی حق تعالیٰ کی زیارت سے مشرف ہوگا۔ اس سلسلے میں امام طحاوی رحمۃ

اللہ علیہ نے قرآن کریم کی آیت کریمہ ﴿وجوہ یومئذٍ ناضرۃ إلی ربھا ناظرۃ﴾ (القیامۃ:۲۲،۲۳) بطور دلیل پیش کی ہے، یعنی مؤمنین کے چہرے اس روز تروتازہ اور ہشاش بشاش ہوں گے اور ان کی آنکھیں محبوب حقیقی کے دیدار مبارک سے روشن ہوں گی۔

لفظ "نظر" جب "إلی" کے ساتھ متعدی ہوتو، اس کے معنی ہیں "المعاینة بالأبصار" آیت میں حرف "إلی" صلہ ہے "ناظرة" کا، اس لئے رؤیت کے معنی میں ہوگا۔ نیز "نظر" کی نسبت چونکہ وجہ (محل بصر) کی طرف کی گئی ہے اس لئے بھی اس سے "نظر العین" مراد ہے۔

رؤیت باری تعالیٰ کی دوسری دلیل: قرآن کی آیت: ﴿لهم مایشاؤن فیها ولدینا مزید﴾ (ق:۳۵) ہے، یعنی جو چاہیں گے وہ ملے گا اور ہمارے پاس ہے کچھ زیادہ بھی۔ قال الطبریؒ: قال علي بن أبي طالب وأنس بن مالک رضي الله عنهما: "هو النظر إلی وجه الله عزوجل" ایک اور جگہ ارشاد ہے۔ ﴿للّذین أحسنوا الحسنیٰ وزیادة﴾ (یونس:۲۶)

بھلے کام کرنے والوں کو وہاں بھلی جگہ ملے گی (یعنی جنت) اور اس سے زیادہ بھی کچھ ملے گا، "زیادة" کی تفسیر "دیدار مبارک" سے کئی احادیث صحیحہ میں وراد ہوئی ہے اور بہت سے صحابہ وتابعین ﷺ سے منقول ہے۔ (فوائد عثمانیہ:۹۷۲)

اور سنت میں دلیل وہ حدیث مشہور ہے، جس کو اکیس اکابر صحابہ نے روایت کیا ہے، الفاظ حدیث یہ ہیں۔ "إنّکم سترَونَ ربّکم کما ترون القمر لیلة البدر": (تم اپنے پروردگار کو اس طرح دیکھو گے، جس طرح چودھویں شب میں چاند کو دیکھتے ہو) یہاں "تشبیه الرؤیة بالرؤیة" مراد ہے۔ "تشبیه المرئي بالمرئي" مراد نہیں تا آنکہ اللہ کے لئے تشبیہ ثابت نہ ہو۔

قرآن وحدیث کے علاوہ رؤیت پر اجماع امت بھی ہے۔

تفسیرہ علی ما أراد ... دراصل معتزلہ نے رؤیت کے بارے میں وارد ہونے والے نصوص قرآن واحادیث میں تحریف سے کام لیا ہے۔ مثلاً امام طحاوی رحمۃ اللہ

علیہ کی پیش کردہ آیت کے بارے میں مخالفین کا کہنا ہے کہ: ''الٰی'' حرف نہیں ہے، بلکہ اسم ہے اور ''آلاء'' کا مفرد ہے، جس کے معنی نعمت کے ہیں اور ''ناظرة'' بمعنی ''منتظرة'' کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان جنت میں اپنے پروردگار کی نعمتوں کا انتظار کریں گے، حالانکہ یہ تاویل قیاس سے بعید اور سیاق کے مخالف ہے، کیونکہ انتظار کو تو ''أشد من الموت'' کہا گیا ہے، جبکہ آیت کا مقصود یہاں اہل ایمان کے لئے خوشی کا بیان ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: اس آیت کریمہ کی وہ تفسیر درست ہوگی، جو اللہ کی مراد اور علم کے مطابق ہو، صرف یہ نہیں بلکہ ''وكل ماجاء ذلك من الحديث الصحيح عن رسول الله ﷺ'' حدیث صحیح جو بھی اس سلسلے میں وارد ہو۔ وعن اصحابه :أي كذلك ماورد عن أصحابه. فهو :حقٌّ ثابتٌ. كماقال:أي كما قال قائله ولكن على المعنى الذي أراده الله. ومعناه:أي وتفسيره. على ماأراد : أي مراد الله تعالىٰ.

ولا متوهمين :أي ظانّين. بأهوائنا :جمع هوىٰ أي هوى النفس. إلاّ من سلم للّٰه تعالىٰ ولرسوله ﷺ :جميع ماصح عنهما من محكم ومتشابه فأخذ بالمحكم على أحكامه. وردّ:أي أسند. علم مااشتبه عليه : علمه. إلى عالمه : أي على مراده. قرآن کریم کے بارے میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ''فما عرفتم منه فاعملوا به، وماجهلتم منه فرُدّوه إلى عالمه'' (بخاري،في افعال العباد) صاحب شرح المقاصد لکھتے ہیں: ''ذهب أهل السنة إلى أن الله تعالىٰ يجوز أن يرى وأن المؤمنين في الجنة يرونه منزهاعن المقابلة والجهة والمكان.'' (شرح المقاصد: ۱۳۴/۳)

> ولا يثبت قدم الإسلام إلّا على ظهر التسليم والاستسلام.
>
> اسلام کا قدم، تسلیم وسپردگی کرنے پر ہی جم سکتا ہے۔

ولا يثبت قدم الإسلام :هذا من باب الاستعارة ،إذ القدم الحسّي لاتثبت إلّا على ظهر شيء. التسليم: بذل الرضاء بالحكم الاستسلام: أي الإنقياد ومنه التسليم فيما خفي المراد منه. یعنی جو قرآن وحدیث کے نصوص کے سامنے سرخم تسلیم نہیں ہوتا، تو اس کا اسلام مضبوط نہیں رہتا، اسلام کے برقرار رہنے کے لئے

نصوص قرآن اور نصوص احادیث کے سامنے تسلیم وانقیاد ضروری ہے۔

روى البخاري عن الإمام محمد بن شهاب الزّهري رحمه الله أنه قال: "من الله الرسالة وعلى الرسول البلاغ وعلينا التسليم"

فَمَنْ رام عِلْمَ ماحُظِرَ عن علمه، ولم يقنع بالتسليم فهْمُه حَجبه مرامُه عن خالص التوحيدِ وصافي المعرِفة وصحيح الإيمان فيتذبْذب بين الكفر والإيمان والتصديق والتكذيب والإقرار والإنكار موسْوِسًا تائهًا، زائغًا شاكًا لامؤمنًا مصدقًا ولاجاحدًا مكذِّبًا.

لہٰذا جوشخص اس چیز کے جاننے کے درپے ہو جس سے اسے روکا گیا ہے اور اس کی سمجھ، قناعت نہ کرے، تسلیم ورضا پر تو اسے اس کا قصد خالص، توحید، دین کی سمجھ اور صحیح ایمان سے روک دے گا، پس وہ کفر وایمان، تصدیق وتکذیب اور اقرار وانکار کے درمیان شک میں ہے، اس کی حالت ہمیشہ شک کرنے والے اور وسوسوں میں مبتلا رہنے والے انسان کی سی ہو جاتی ہے جو ایمان کا نہ اقرار کر رہا ہوتا ہے نہ انکار۔

پچھلے جملوں میں جو مضمون ذکر ہوا، یہ اس کی مزید تاکید ہے، حاصل یہ کہ علم کے بغیر امور دین میں گفتگو کرنا منع ہے۔

فمن رام: أي طلب. علم ما حُظر عن علمه: أي مُنع علمه. حجبه: أي منعه. مرامه: أي مطلبه. عن خالص التوحيد ... من إضافة الصفة إلى الموصوف، في المواضع الثلاث إي التوحيد الخالص والمعرفة الصافية والإيمان الصحيح. فيتذبذب: أي يتردد.

موسوِسًا: اسم فاعل کا صیغہ ہے وسوسہ والا ہونا۔ تائهًا: سرگشتہ وحیران (ض) سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ "لامؤمنًا مصدِّقا ولا جاحدًا مكذبًا" یہ "زائغاشاكًا" کی تفسیر ہے۔

ولا یصح الإیمان بالرّؤیة لأهل دار السّلام لمن اعتبرها منهم بوهم أو تأوّلها بفهم،إذ کان تاویل الرؤیة وتأویل کل معنی یضاف إلی الربوبیة. لا یصح، فلایصح الإیمان بالرؤیة إلاّ بترک التأویل ولزوم التسلیم، وعلیه دین المرسلین ومن لم یتوق النفي والتشبیه زلّ ولم یُصبِ التنزیه.

اوراہل جنت کی روئیت باری تعالیٰ (اللہ کے دیدار) پر ایمان صحیح نہ ہوگا اس شخص کا، جس نے رؤیت کا وہم سے اعتبار کیا یا فہم سے اس کی تاویل کی جبکہ رؤیت کی تاویل کرنا ایسے ہی ہر اس صفت کی تاویل جس کی نسبت ربوبیت کی طرف ہو، درست نہیں، چنانچہ روئیت پر ایمان ،تاویل کو چھوڑنے اور تسلیم ورضا کو لازم پکڑنے کے ساتھ ہی درست ہوگا اور اسی پر انبیاء علیہم السلام کا دین ہے، جو شخص نفی اور تشبیہ سے نہیں بچا، پھسل گیا۔اور تنزیہ (اللہ تعالیٰ کو صفت نقائص سے پاک سمجھنے) تک رسائی حاصل نہ کرسکا۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ منکرین رؤیت (معتزلہ) اوران لوگوں کی تردید کررہے ہیں، جو رؤیت باری تعالیٰ کے مسئلہ میں تاویل سے کام لے رہے ہیں، جو اس میں تاویل کرے گا، اس کی دو صورتیں ہیں یا تو رؤیت کو مانے گا، مگر اس رؤیت کو تشبیہ دے گا مخلوق کی رؤیت کے ساتھ۔ یا رؤیت کا بالکلیہ انکار کرے گا اور دونوں طریقے باطل ہیں، کیونکہ اول میں تشبیہ ہے اور ثانی میں تعطیل ہے۔

لأهل دار السلام : أي لأهل الجنة. بوهمٍ: توهمه. جس میں اس نے اپنے وہم کا اعتبار کیا ہو، مثلاً یہ سوچا کہ اللہ اصلاً دکھائی نہیں دیتے ہیں اور اگر نظر آئے بھی تو وہ کسی خاص شکل وصورت میں ہوں گے، حالانکہ اس وہم کو دفع کرنا اس پر لازم تھا۔

أو تأوّلها بفهم :أي أدّی أنه فهم لها تاویلا یخالف ظاهرها. وتأویل کل معنی :أي بل تأویل کل معنی ترک تاویل سے، ترک تاویل فاسد مراد ہے، کیونکہ وہ تحریف کے درجے میں ہے ورنہ تاویل کی ایک قسم تاویل صحیح بھی ہے جو مفسرین کے ہاں معتبر ہے۔وعلیه : أي علی ذالک المذکور. ومن لم یتوق : یعنی جس نے اللہ کی صفات کی نفی سے احتراز نہیں کیا، بلکہ اللہ کی صفات کی نفی کی۔جیسا کہ معطلہ کا مسلک

ہے۔ والتشبيه: أي ومن لم يتوق التشبيه. جواللہ کی صفات کی تشبیہ سے محفوظ نہ رہا، بلکہ اللہ کی صفات کو مخلوق کی صفات سے تشبیہ دیتا ہے، جیسا کہ مجسمہ کا خیال ہے۔ زل أي عن مايبتغيه وضل. ولم يصب التنزيه : أي وما فر بزعمه منه وقع فيه.

معتزلہ کا خیال ہے کہ: ہم رؤیت کی نفی کر کے اللہ کی تنزیہ کرر ہے ہیں، حالانکہ صفت کمال کی نفی سے تنزیہ کیونکر ہوسکتی ہے؟ اس لئے کہ جب اہل ایمان اللہ کو دیکھیں گے، مگر اللہ تعالیٰ کی ذات کا احاطہ نہیں کرسکیں گے، تو مرئی ہونے کے باوجود مُحاط نہ ہونا صفت کمال ہے، رؤیت کی نفی، صفت کمال نہیں "إذ المعدوم لايُرى" نہ دکھائی دینا تو معدوم کی صفت ہے۔

> **فإنّ ربّنا جلّ وعلا موصوفٌ بصفات الوحدانيّة، منعوت بنعوت الفردانية، ليس في معناه أحد من البريّة.**
>
> کیونکہ ہمارا پروردگار جلّ وعلا، صفات وحدانیت کے ساتھ متصف ہے اور صفات فردانیت کے ساتھ منعوت ہے، مخلوق میں سے کوئی اس کا ہم وصف نہیں ہے۔

یہ عبارت ماقبل میں اثبات الصفات اور نفی التشبیہ کی تاکید ہے، یعنی اللہ کی رویت تو ہوگی، مگر مخلوق کی طرح نہیں، کیونکہ اللہ کی ذات کی طرح ان کی صفات بھی یکتا ہیں۔ وصف اور نعت مترادف ہیں، وحدانیت اور فردانیت بھی مترادف ہیں، البتہ بعض نے ان دونوں میں فرق کیا ہے، یعنی وحدانیت ذات کے ساتھ خاص ہے، جبکہ فردانیت صفات کے ساتھ خاص ہے،" فهو تعالىٰ متوحد في ذاته متفرد بصفاته"

جلّ أي عظُم. علا: أي ارتفع عما لايليق به.

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے جملے سے ﴿الله أحد﴾ دوسرے جملے سے ﴿اللّٰه الصّمد لم يلد ولم يولد﴾ اور تیسرے جملے سے ﴿ولم يكن لّه كفوًا أحد﴾ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وتَعالٰى اللّٰه عن الحدودِ، والغاياتِ، والأركان، والأعضاء، والأدوات، لاتحويه الجهات السّت كسائر المبتدَعات.

اللہ تعالیٰ حدود ونہایات اور جسمانی ارکان واعضاء وآلات سے بالاتر ہے اور نہ ہی عام اشیاء (مخلوقات) کی طرح جہات ستہ اس پر حاوی ہیں۔

الأركان: جمع ركن وهولغةً: الجانب القوى واصطلاحًا مايقوم به ذلک الشيء. **والأدوات:** جمع أداة وهي الآلة.

اس عبارت سے ان مشبہہ کی تردید کررہے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے لئے جسم اور اعضاء کے قائل ہیں، حاصل یہ کہ اللہ تعالیٰ اس سے منزہ ہے کہ کوئی اللہ تعالیٰ کے حدود اور غایات کا احاطہ کرسکے، کیونکہ حدود اور غایات محدثات کے اوصاف ہیں، آگے امام طحاویؒ کے کلام: "وقد أعجز عن الإحاطة خلقه" میں اسی بات کی مزید تشریح آرہی ہے۔ كسائر المتبدعات "أي كسائر المخلوقات." یعنی تمام مخلوقات پر جہات ستہ (دائیں، بائیں، اوپر، نیچے، آگے، پیچھے کی اطراف) حاوی ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی ذات جہات ستہ سے قبل بھی، جہات ستہ کے بغیر موجود تھی اور اب بھی اللہ کی ذات اسی طرح موجود ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ خود خالق جہات ہے تو مخلوق، خالق کا کیسے احاطہ کرسکتی ہے؟ اور کیسے اس کو حاوی ہوسکتی ہے؟

فائدہ: ۔اللہ کی صفات "ید، وجه، ساق اور نفس" قطعی دلائل سے ثابت ہیں، ولكن لايقال لهذه الصفات: أنها أعضاء، أو جوارح، أو أدوات، أو أركان، فإن كل هذه المعاني منتفية عن اللّٰه تعالىٰ فيقال للّٰه تعالىٰ يدٌ ليس كيدنا، وللّٰه وجهٌ ليس كوجهنا. پس یہ صفات مشترک "بين اللّٰه وبين الإنسان." ہیں، لیکن اشتراک صرف لفظی ہے اشتراک معنوی نہیں ہے۔

الغرض مذکورہ صفات (ید، ساق، وجہ، اصبع، نفس، نزول وغیرہ) حق تعالیٰ کی صفات ہیں، لیکن ان متشابہات میں ظاہری معنی، جو تشبیہ کو مستلزم ہے، مراد نہیں ہوتا ہے۔ مثلاً جسمانی ہاتھ جیسا ہمارا ہاتھ ہے، یہ بے شک مراد نہیں، کیونکہ یہ ظاہر متعارف ہے اب

سوال یہ ہے کہ ان الفاظ کے معنی کیا ہیں؟ اس سلسلے میں ایک مذہب تو متکلمین اور متاخرین کا ہے، انہوں نے متشابہات کی مناسب تاویلات کیں، اس لئے ان کو "مؤولہ" کہتے ہیں، دوسرا مذہب متقدمین اور محدثین کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ: متشابہات کے معنی مراد اور ان کی کیفیت کے بارے میں توقف وسکوت کیا جائے گا، ان حضرات کو "مفوِضہ" کہتے ہیں۔ جمہور محدّثین میں علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ بھی شامل ہیں، البتہ جمہور اور علامہ کے مذہب میں ایک باریک فرق ہے، چنانچہ جمہور محدّثین ان الفاظ کی تشریح ہی سے توقف کرتے ہیں نہ یہ کہتے ہیں کہ اس کے حقیقی معنی مراد ہیں اور نہ یہ کہتے ہیں کہ مجازی معنی مراد ہے، جبکہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ان الفاظ کو حقیقی معنی پر محمول کر کے اس کی کیفیت سے توقف کرتے ہیں، علامہ ان الفاظ کی تشریح سے توقف نہیں کرتے، جبکہ جمہور الفاظ متشابہہ کی تشریح ہی سے توقف کرتے ہیں۔ البتہ یہ فرق (معاذ اللہ) تشبیہ اور تنزیہ کا فرق نہیں، بلکہ تنزیہ کی تعبیر کا فرق ہے، لہٰذا اس مسئلے میں علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کو جمہور اہل سنت سے مختلف قرار دے کر نشانہ ملامت بنانا درست نہیں ہاں اس قسم کے مسائل میں سلامتی کا راستہ جمہور ہی کا ہے جو ان الفاظ کی تشریح ہی سے توقف کرتے ہیں۔

(ملخص از درس ترمذی، افادات حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی: ۲/ ۲۰۴)

واضح رہے کہ دونوں مذہبوں میں تفویض اولیٰ ہے، لیکن جس شخص سے خطرہ ہو کہ اگر اس کے سامنے تاویل نہ کی گئی تو وہ کسی شک میں یا کسی بداعتقادی میں واقع ہو جائے گا، اس کے لئے ایسی تاویل جو لغۃً واستعمالاً بے تکلف ہو، اختیار کرنے کی گنجائش ہے، چنانچہ متشابہات کی مناسب تاویلات، کتب تفاسیر وشروح احادیث میں موجود ہیں، لیکن یہ یاد رکھیئے کہ تاویل کا منشا صرف اسی قدر ہے کہ جب مجسمہ نے اس قسم کی آیات واحادیث سے اللہ تعالیٰ کی جسمیت کا خیال کیا تو علماء متاخرین نے ان کے الزام واسکات کے واسطے تاویل کرنا شروع کیا نہ اس غرض سے کہ یہ معانی مؤوّلہ مراد ہیں، بلکہ اس غرض سے کہ جسمیت کا شبہ دفع ہو جائے۔ اس لئے لامذہب (غیر مقلدین) کا مؤوّلہ کو منکرین صفات کے زمرے میں شامل کر کے ان کو مورد الزام ٹھہرانا، نہایت غلو ہے۔ أعاذنا اللّٰہ منه.

معراج

والـمعراج حقٌّ وقد أُسري بالنبي ﷺ وعُـرج بشخصه في اليقظة، إلـى السّـمـاء، ثـمّ إلـى حيـث شاء اللّٰه من العُلٰى ، وأكرمه اللّٰه بما شاء، وأوحى إليه ما أوحىٰ ما كذب ا لفُؤاد مـا رأىٰ، فصلىّ اللّٰه عليه وسلم في الأخرة والأُولٰى.

معراج برحق ہے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو رات کے وقت سیر کرائی اور بیداری کی حالت میں آپ ﷺ کی ذات اقدس کو آسمان کی طرف اٹھایا گیا، پھر بلندیوں پر اللہ تعالیٰ نے جہاں تک چاہا لے گیا اور اپنی چاہت کے مطابق آپ کو عزت بخشی ،اب وحی فرمائی اپنے بندے کو جو وحی فرمائی، دل نے جھوٹ نہ کہا جو دیکھا، دنیا و آخرت میں آپ ﷺ پر درود و سلام ہو۔

والمعراج :أي نـقول المعراج حق. **المعراج**: مـفعال من العروج، أي:ألالة التّـي يعـرج فيهـا ، أي يـصعد، وهو بمنزلة السُّلّم، لكن ّلانعلم كيف هو؟ وحكمه كحكم غيره من المغيبات،نؤمن به ولا نشتغل بكيفيته.

علماء کی اصطلاح میں مکہ سے ام ہانی کے گھر سے، بیت المقدس تک کے سفر کو ''إسراء'' اور وہاں سے اوپر ''سـدرة المنتهٰى'' تک کی سیاحت کو ''معراج'' کہتے ہیں اور بسا اوقات دونوں سفروں کے مجموعہ کو ایک ہی لفظ ''اسراء'' یا ''معراج'' سے تعبیر کر دیا جاتا ہے، مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کا زمینی سفر جو ''اسراء'' کہلاتا ہے قطعی ہے، کتاب اللہ کی آیت ﴿سبـحان الذي أسرىٰ بعبده ليلاً من المسجد الحرام إلى الـمسجد الأ قصىٰ .﴾ سے ثابت ہے اور پھر مسجد اقصیٰ سے آسمانوں کی طرف عروج جو معراج کہلاتا ہے، اس کا ذکر سورۃ نجم کی آیات میں اور احادیث متواترہ سے ثابت ہے، اور آسمانوں سے اوپر عرش تک یا جنت تک یا اس کے علاوہ جن مقامات تک اللہ نے لے جانا چاہا، اخبار آحاد سے ثابت ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:''وحـديـث الإسـراء

أجمع عليه المسلمون و أعرض عنه الزنادقة و الملحدون "(ابن کثیر)

مذہب راجح یہی ہے کہ معراج واسراء کا واقعہ حالت بیداری میں **بجسده الشريف** واقع ہوا جس کو عروج صوری اور عروج آسمانی کہتے ہیں۔ سلف میں سے یہ کسی کا قول نہیں کہ معراج حالت بیداری میں محض روحانی طور پر ہوئی ہو۔ یا منامی طور پر یا کشفی طور پر۔ بڑے صحابہ کرام ﷺ کی روایت اس واقعہ معراج میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت(**و اللّٰه ما فقد جسد محمد ﷺ في ليلة الإسراء**) سے مقدم ہے۔ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ: عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں فقدان کے معنی طلب کے ہیں۔ (گم ہوجانے والا معنی یہاں مراد نہیں) اب عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس ارشاد کا مطلب صاف ہے کہ آپ ﷺ اتنی دیر تک گھر سے غائب نہیں رہے کہ آپ ﷺ کی طلب اور تلاش کی جاتی، یعنی آپ ﷺ گھر سے جدا تو ہوئے، مگر زیادہ دیر نہیں لگی جس سے گھر والوں کو پریشانی ہوئی ہو اور تلاش کی نوبت آئی ہو اس طرح تطبیق ہوجائیگی، باقی طلب اور تلاش کے معنی میں فقدان کا استعمال نص میں بھی آیا ہے۔ "**قالوا و أقبلوا عليهم ماذا تفقدون**" .

عُرج بشخصه: سے اشارہ ہے کہ معراج روح کی نہیں تھی۔ **في اليقظة**: سے اشارہ ہے کہ معراج عالم خواب میں نہ تھی۔

مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک یہ سفر براق پر ہوا، جب دروازہ بیت المقدس پر پہنچے تو براق کو دروازہ کے قریب باندھ دیا اور آپ مسجد بیت المقدس میں داخل ہوئے اور اس کے قبلہ کی طرف تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں ادا فرمائیں اس کے بعد ایک زینہ لایا گیا، اس زینہ کے ذریعے آپ پہلے آسمانوں پر تشریف لے گئے۔ اس کے بعد باقی آسمانوں پر تشریف لے گئے، ہر آسمان میں وہاں کے فرشتوں نے آپ کا استقبال کیا اور ہر آسمان میں ان انبیاء علیہم السلام سے ملاقات ہوئی، جن کا مقام کسی معین آسمان میں ہے، چنانچہ آسمان اول پر آدم علیہ السلام سے اور دوسرے آسمان پر یحییٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام سے اور تیسرے پر یوسف علیہ السلام سے اور چوتھے پر ادریس علیہ السلام سے اور پانچویں پر ہارون علیہ السلام سے اور چھٹے پر موسیٰ علیہ السلام سے اور ساتویں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔

معراج کی احادیث تقریباً تیس صحابہ سے منقول ہیں جن میں معراج واسراء کے واقعات بسط وتفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

وأوحى إليه ماأوحى: یعنی جبریل جب حضور ﷺ کے نزدیک ہو گئے، اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندہ محمد ﷺ پروحی بھیجی، غالباً اس سے مراد سورۃ مدثر کی ابتدائی آیات ہیں اور کچھ احکام ہوں گے۔(فوائد عثمانیہ)

ماكذب الفؤاد مارأى: یعنی جبریل کو آپ نے آنکھ سے دیکھا اور اندر سے دل نے کہا کہ اس وقت آنکھ ٹھیک ٹھیک جبریل کو دیکھ رہی ہے، کوئی غلطی نہیں کر رہی کہ کچھ کا کچھ نظر آتا ہو۔ (فوائد عثمانیہ)

نوٹ:۔ آسمان سے نبی اکرم ﷺ کا آگے جانا کہاں تک ہے؟ اس میں اختلاف ہے اس وجہ سے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا تعین نہیں فرمایا۔

حوض کوثر

> **والحوض: الذي أكرمه الله تعالىٰ به غِياثًا لأمّته حق.**
>
> حوض کوثر، جس کے ذریعے اللہ نے آپ کو عزت بخشی، آپ کی امت کی سیرابی کے لئے برحق ہے۔

میدان محشر میں ایک حوض ہوگا، جس میں جنت کی ''کوثر'' نامی نہر کا پانی دو آسمانی پرنالوں کے ذریعہ ڈالا جائے گا چنانچہ اصل نہر کوثر جنت میں ہے، لیکن اس حوض کو بھی ''کوثر'' کہتے ہیں، حوض کوثر کے عجیب وغریب اوصاف احادیث متواترہ میں بیان ہوئے ہیں، شارح ابن ابی العزؒ کے الفاظ میں ان اوصاف کا خلاصہ یہ ہے۔ ''**إنّه حوض عظيم ومورد كريم، يمد من شراب الجنة، من نهر الكوثر الّذي هو أشد بياضًا من اللبن وأبرد من الثلج، وأحلىٰ من العسل، وأطيب ريحًا من المسك، وهو في غاية الاتساع، عرضه وطوله سواء، كل زاوية من زواياه مسيرة شهر.**''

اس کے علاوہ احادیث میں یہ بھی ہے کہ اس حوض پر جو آب خورے (پانی پینے

کے برتن) رکھے ہوں گے وہ آسمان کے ستاروں سے زیادہ تعداد میں ہوں گے اور ستاروں سے زیادہ چمکدار ہوں گے۔'' من شرب منه شربة لايظمأأبدًا. '' ایک مرتبہ جو حوض سے پی لے گا، پھر وہ کبھی پیاسا نہ ہوگا، لوگ قبروں سے پیاسے اٹھیں گے، آنحضرت ﷺ اپنی امت کے پیاسوں کو اسی حوض کوثر سے پانی پلائیں گے اس لئے آپ کو''ساقی کوثر'' کہا جاتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:''أنا فرطكم على الحوض'' میں حوض میں تمہارا پیشرو ہوں گا، یعنی سب سے پہلے میں پہنچوں گا۔ حوض ہر نبی کا ہوگا جو اپنی اپنی امت کو سیراب فرمائیں گے، لیکن سب سے بڑا حوض محمد عربی ﷺ کا ہوگا اور یہاں آنے والوں کی تعداد بھی زیادہ ہوگی۔ (شرح عقيدة سفارينيةونبراس)

شفاعت

> **والشّفاعة الّتي ادّخرها الله لهم كما روى في الأخبار.**
>
> امت کے لئے رسول اللہ ﷺ کی وہ سفارش برحق ہے، جس کو اللہ نے لوگوں کے لئے ذخیرہ بنا کر رکھا ہے جیسا کہ متعدد احادیث میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

والشفاعة: أي ونقول الشفاعة العظمىٰ لرسول الله ﷺ يوم القيامة في كافّة الخلق لإراحتهم من الموقِف حقٌ.

یوں تو شفاعت کا ثبوت انبیاء اور صلحاء سب کے لئے ہے، لیکن شفاعت عظمیٰ (جس کو شفاعت کبریٰ بھی کہتے ہیں) صرف ہمارے پیغمبر پاک ﷺ کی خصوصیت ہے، کسی اور نبی کو یہ خصوصیت نہیں دی گئی ہے، اس شفاعت عظمیٰ کی تفصیل اس حدیث میں ہے، جس میں فرمایا کہ: میدان محشر میں شدت گرمی سے سب لوگ تنگ آکر آدم، نوح، ابراہیم، موسیٰ، اور عیسیٰ علیہم السلام کے پاس شفاعت کے لئے یکے بعد دیگرے جائیں گے اور یہ سب معذرت پیش کریں گے اور بالآخر پیغمبر پاک ﷺ کے پاس آکر شفاعت طلب کریں گے، اللہ کے رسول سجدہ میں گر کر اللہ کی خوب تعریف کریں گے اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے: ''يامحمّد !إرفع رأسک، سَلْ تُعْطَه، إشفعْ تُشفّع'' یعنی اے محمد! اپنے سر کو سجدہ سے اٹھائیے، مانگو تجھے دیا جائے گا، شفاعت کر تیری شفاعت قبول کی جائے گی، الغرض

خاتم الانبیاء ﷺ یہ شفاعت کبریٰ میدان محشر کی سختی میں تخفیف اور حساب و کتاب شروع کروانے کے لئے فرمائیں گے۔

اہل کبائر کے حق میں حضرات انبیاء اور صلحاء امت کی شفاعت بمعنی گناہ معاف کیے جانے کی سفارش ہوگی۔ جسے اللہ تعالیٰ منظور بھی فرمائیں گے، اس سلسلے میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت سے حدیث ہے: "**شفاعتي لأهل الكبائر من أمّتي**" (رواہ الامام احمد) واضح رہے کہ شفاعت میں شرط یہ ہے کہ شفیع عند اللہ مقبول ہو، یعنی انبیاء اور صلحاء میں ہو اور مشفوع لہ شفاعت کا اہل ہو یعنی مؤمن و موحد ہو، کیونکہ کافر مشرک کی شفاعت نہیں ہوگی۔

معتزلہ کہتے ہیں کہ: شفاعت گناہ معاف کرانے اور گناہ گار کو عذاب سے رہائی دلانے کے لئے نہیں ہوگی (جیسا کہ اہل سنت کہتے ہیں) بلکہ نیک بندوں کے ثواب میں زیادتی اور اضافہ کرنے کے لئے ہوگی، غرض یہ کہ اہل جنت کے لئے رفع درجات اور مراتب کی بلندی کے لئے نبی کریم ﷺ جو شفاعت فرمائیں گے، اہل سنت کی طرح معتزلہ بھی اس کے قائل ہیں، ایسے ہی معتزلہ شفاعت عظمیٰ کے بھی قائل ہیں، معلوم ہوا کہ وہ شفاعت کی ایک خاص قسم کے منکر ہیں۔

عہد میثاق

والميثاق: الَّذي أَخذه اللّٰه تعالىٰ من آدم عليه السّلام و ذرّيته حقٌّ.

سیدنا آدم علیہ السلام اور اولاد آدم سے اللہ تعالیٰ نے جو میثاق (اقرار) لیا وہ بھی برحق ہے۔

اس میثاق سے مراد وہ میثاق ہے کہ جس کا ذکر "سورۃ الاعراف ۱۷۲" میں ہے۔

ارشاد ہے: ﴿**وإذ أخذ ربک من بني ادم من ظهورهم ذريّتهم وأشهدهم علىٰ أنفسهم ج ألستُ بربكم ط قالوا بلىٰ ج شهِدنا.**

جب نکالا تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو اور اقرار کرایا ان سے ان کی جانوں پر۔ کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب؟ بولے ہاں ہے۔ ہم اقرار کرتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب موضح القرآن میں فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی پُشت سے ان کی اولاد اور اُن سے ان کی اولاد نکالی۔ سب سے اقرار کروایا اپنی خدائی کا، پھر پشت میں داخل کیا، اس سے مدعیٰ یہ ہے کہ خدا کے رب مطلق ماننے میں ، ہرکوئی آپ کفایت کرتا ہے، باپ کی تقلید نہ چاہئے اگر باپ شرک کرے، بیٹے کو چاہئے ایمان لاوے اگر کسی کو شبہ ہو کہ وہ عہد تو یاد نہیں رہا پھر کیا حاصل؟ تو یوں سمجھے کہ اس کا نشان ہر کسی کے دل میں ہے اور ہر زبان پر مشہور ہو رہا ہے کہ سب کا خالق اللہ ہے سارا جہاں قائل ہے اور جو کوئی منکر ہے یا شرک کرتا ہے سو اپنی عقل ناقص کے دخل سے پھر آپ ہی جھوٹا ہوتا ہے۔

وقد عَلِمَ اللّٰه تعالیٰ فیما لم یزل عدد من یدخل الجنة وعدد من یدخل النار جملة واحدة فلا یُزاد في ذلک العدد ولا یُنقص منه. وکذلک افعالهم فیما علم أنهم یفعلونه.

اللہ تعالیٰ کو ازل سے ان سب لوگوں کا مکمل علم ہے جو جنت میں جائیں گے اور جہنم میں جائیں گے، اس تعداد میں کسی قسم کا اضافہ ہوگا اور نہ کمی اسی طرح لوگوں کے وہ اعمال بھی اللہ کے علم میں ہے جو ان کو مستقبل میں سرانجام دینے ہیں۔

علم اللّٰه تعالیٰ :أی ونقول قدعلم اللّٰه.... . فیما :أي في علمه الأزليّ الّذي. لم یزل : علیه و کذلک أفعالهم فیما : أي في الّذي علم منهم أنهم یفعلونه من خیرٍ وشرٍ ونفع أوضر.

غرضیکہ جتنے لوگ جنت میں داخل ہوں گے ان کی تعداد اور جو جہنم میں جائیں گے، سب کی تعداد اللہ تعالیٰ کے علم میں ازل سے ہے،

وکلٌّ مُیسَّرٌ لّما خُلق له والأعمال بالخواتیم، والسّعید من سعِد بقضاء اللّٰه، والشّقِيّ من شَقِيَ بقضاء اللّٰه.

ہر شخص کے لئے وہی کام آسان کیا جاتا ہے، جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے، اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہے، سعادت مند وہ ہے جس کے لئے تقدیر میں سعادت لکھ دی گئی، بدبخت (بدنصیب) وہ ہے جس کی تقدیر میں بدبختی لکھ دی گئی ہو۔

وكـل ميسرٌ... یہ مضمون حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: "**إعـمـلوا فـكـل ميسر لّما خلق له ، أما أهل السعادة، فييسرون لعملِ أهل السعادة ، وأما أهل الشقاوة فييسرون بعمل أهل الشقاوة**"۔

تم عمل کرو، ہر شخص جس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے، وہ اس کے لئے آسان کردیا جاتا ہے، جو اہل سعادت سے ہوتا ہے اسے اہل سعادت والے عمل کی توفیق دے دی جاتی ہے، اور جو اہل شقاوت سے ہوتا ہے، اس کے لئے اہل شقاوت والے عمل آسان کردیئے جاتے ہیں۔ (تفسیر بخاری سورۃ اللیل)

﴿**فـأمّـا مَـنْ أعـطـىٰ واتّـقـىٰ وصدّق بالحسنىٰ**﴾ [الاية] کا بھی یہی مطلب ہے: الحاصل اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ سعداء جب نیک عمل اختیار کرتے ہیں اور اشقیاء جب بدعمل کی طرف چلتے ہیں تو دونوں کے لئے وہی راستہ آسان کردیا جاتا ہے جوانہوں نے تقدیر الٰہی کے موافق اپنے ارادہ واختیار سے پسند کرلیا ہے۔

والأعمال بالخواتيم :**أي والأعـمال إنما تعتبر بالخواتيم**. اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہے، عقائد النسفی میں اس کی تشریح کچھ اس طرح ہے: "**والسـعـيـد قـد يشـقـى والشقي قديسعد**" یعنی زندگی بھر ایک آدمی اچھے اعمال کرتا ہے، مگر زندگی کے آخری لمحات میں کچھ اس طرح عمل کرگزرتا ہے، جس کی وجہ سے اس کی سعادت، شقاوت میں تبدیل ہوجاتی ہے، اور کبھی اس کے برعکس زندگی بھر اعمال کفر کرتا ہے، مگر بالآخر ایسا بھلائی کا کام کرگزرتا ہے، جس کی وجہ سے نیک بخت ہوجاتا ہے۔ "**والسـعـيـد من سـعـد بـقـضـاء الله تعالىٰ والشقي من شقي بقضاء الله تعالىٰ**:" سے اشارہ کرنا چاہتے ہیں، کہ خواتیم کی بناء اللہ کے سابقہ قضاء پر ہے، یعنی سعید اور شقی ابھی وجود میں نہیں آیا، مگر اس کی سعادت اور شقاوت کا فیصلہ پہلے کیا جاچکا ہے، جس کے لئے فیصلہ سعادت ہے، وہ اللہ کا فضل ہے اور جس کے لئے فیصلہ شقاوت ہے، وہ اس کا عدل ہے۔ ہوگا تو وہی جو فیصلہ قدرت کا ہوچکا ہے، مگر اس کے باوجود انسان کا اختیار اور اس کی قدرت جس کی بناء پر وہ امور شرعیہ کا مکلف ہے، برقرار ہے۔

وأصل القَدَر سِرُّ اللّٰه في خَلقِهِ لم يَطَّلِع على ذٰلک ملکٌ مقرَّبٌ ولانبيٌ مرسل، والتعمُّق والنظر في ذلک ذريعةُ الخُذلان ،وسُلَّمُ الحِرمان، ودرجةُ الطغيان فالحذرَ كلَّ الحذر من ذلک، نظرًا أو فكرًا أو وسوسةً فإنّ اللّٰه تعالىٰ طوىٰ علمَ القدر عن أنامه ونهاهم عن مرامه كما قال تعالىٰ في كتابه:﴿لايَسئلُ عمّا يفعل وهم يسئلون﴾[الأنبياء: ٢٣] "فمن سألَ لما فعلَ؟ فقدردّ حكمَ الكتاب ومن رَدّحكمَ الكتاب، كان من الكافرين.

تقدیر کی حقیقت یہ ہے کہ یہ مخلوق میں اللہ تعالیٰ کا ایک راز ہے، جس کی اطلاع نہ تو مقرب فرشتہ کو ہے نہ ہی کسی نبی مرسل کو، تقدیر میں غور وفکر، نامرادی، محرومی اور سرکشی کا ذریعہ ہے۔ مسئلہ تقدیر میں گھسنے سے مکمل اجتناب ضروری ہے، چاہے اس کا تعلق غور وفکر وسوسے اور خیالات سے ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تقدیر کا علم اپنی مخلوق سے سمیٹ لیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''وہ جو کام کرتا ہے اس سے پوچھا نہیں جائے گا اور جو کام یہ لوگ کرتے ہیں، اس کے بارے میں ان سے پوچھ ہوگی، جس نے اعتراضاً یہ سوال اٹھایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کام کیوں کیا؟ اس نے قرآن مجید کے حکم کو ٹھکرا دیا اور جس نے قرآن مجید کے حکم کو ٹھکرادیا وہ زمرۂ کفار میں شامل ہوگیا۔

قدر :بتحريک الدال وتسكينها. سر اللّٰه :أي علمه بمايكون. لم يطّلع على ذلک : السرِ الّذي أسرّه سبحانه وتعالىٰ. حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی ارشاد ہے: "القدر سر اللّٰه فلايكشفه". التعميق: هو المبالغة في الشيء. الخذلان : بالضم ، ترک العون والنصرة. سلّم الحرمان : بكسر الحاء، یعنی صحیح ایمان پر استقامت سے محرومی کا ذریعہ ہے۔ الذريعة والوسيلة والدرجة والسلم متقارب المعنى، وكذلک الخُذلان والحِرمان والطغيان متقارب المعنى أيضًا، لكن الخذلان في مقابلة النصر، والحرمان في مقابلة الظفر،

والطغيان في مقابلة الاستقامة. فالحذر... :أي إذا كان الأمر كذلک، فاحذر حذرًا کلَّ الحذر. "فالحذر" کے اوپر فا فصیحیہ ہے اور یہ "احذر" فعل کا مفعول مطلق ہے اور "کل الحذر" اس کی تاکید ہے آگے نظرًا، وفکرًا و، وسوسةً تمیز ہے۔

نوٹ: امام طحاویؒ نے مسئلہ تقدیر ایک جگہ بیان نہیں کیا، بلکہ متفرق مقامات میں بیان کیا ہے۔

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ ہر چیز جو پیش آنے والی ہے، اللہ کے علم میں پہلے سے ٹھہر چکی ہے "وخالف في ذلک القدرية "قدریہ کا خیال ہے کہ: ہر چیز جو پیش آنے والی ہے وہ اللہ کے علم میں پہلے سے نہیں ٹھہر چکی ہے، بلکہ ان چیزوں کے وقوع کے بعد اللہ تعالیٰ ان کو جان لیتا ہے۔ الغرض قبل از وقوع حوادث ہر ایک چیز سے فرداً فرداً اور تفصیلاً اللہ تعالیٰ کا علم محیط اور ازلی متعلق اور وابستہ ہے نہ یہ کہ وقوع کے بعد ان سے اللہ تعالیٰ کا علم وابستہ ہوتا ہے جیسا کہ قدریہ کا خیال ہے۔ "وسميت هذه الفرقة القدرية لإنكارهم القدر.

ومن ردّ حكم كتاب الله ....: شکل اول سے قیاس اقترانی کی شکل بن گئی وہ اس طرح کہ فمن سأل :لم فعل ؟ فقد رد حكم كتاب الله صغریٰ۔ ومن رد حكم كتاب الله كان من الكافرين کبریٰ۔ اب نتیجہ ہوگا "من سأل: لم فعل ؟ كان من الكافرين."

> فهذا جملة مايحتاج إليه من هو منوّرٌ قلبه من أولياء الله تعالىٰ وهي درجة الرّاسخين في العلم، لأنَّ العلم علمان: علمٌ في الخلق موجودٌ وعلمٌ في الخلق مفقود، فإنكار العلم الموجود كفرٌ ،وإدّعاء العلم المفقودِ كفر ولايثبت الإيمان إلا بقبول العلم الموجود، وترک طلب العلم المفقود.
>
> یہ وہ تمام باتیں ہیں جن کی ضرورت ہر اس شخص کو ہوتی ہے، جن کے دل منور ہوں اللہ کے اولیاء میں سے، اور یہ مقام ومرتبہ راسخین فی العلم کو نصیب

ہوتا ہے، کیونکہ علم دو طرح کا ہے ایک علم، مخلوق میں موجود ہے اور دوسرا علم، مخلوق میں ناپید ہے، موجود علم کا انکار اور مفقود علم کا دعویٰ کفر ہے، علم موجود کے قبول کرنے اور علم مفقود کے ترک کرنے سے ایمان میں مضبوطی نصیب ہوتی ہے۔

یعنی وہ مذکورہ باتیں جن پر اعتقاد رکھنا ضروری ہے، ایمان کامل کی علامت ہیں، اس لئے وہ اولیاء اللہ جن کے قلوب منور ہوتے ہیں وہ بھی ان کے ماننے کی جانب محتاج ہیں "علم موجود" سے مراد ہے، علم الشریعۃ (چاہے اصول ہو یا فروع) اور "علم مفقود" سے مراد، تقدیر کا علم ہے۔ حاصل یہ ہے کہ موجود علم کا انکار کفر ہے، "**فمن أنكر شيئًا ممّا جاء به الرّسول كان من الكافرين**" اور مفقود علم کا دعویٰ کفر ہے، "**فمن ادّعى علم الغيب كان من الكافرين**" جو لوگ غیر اللہ کو عالم الغیب کہتے ہیں، ان مضامین میں ان کو گہرائی کے ساتھ غور کر لینا چاہئے۔

لوح وقلم

وَنُؤْمِنُ بِاللَّوحِ والقَلَم، وبجميع مافيه قد رُقم.

ہم لوح وقلم اور ان تمام چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں جو تقدیر میں لکھ دی گئی ہیں۔

"لــــوح": سے، لوح محفوظ مراد ہے، جس کی تعریف علامہ عبد الغنی میدانی (شارح کتاب ہذا) کے الفاظ میں یہ ہے، "**وهو جسم عظيم نوراني كتب فيه القلم بإذن الله تعالىٰ ما هو كائن إلى يوم القيامة**"۔ "قلم": سے مراد وہ خاص قلم ہے، جس کا ذکر حدیث میں اس طرح آیا ہے کہ: "**أوّلُ ماخلق الله تعالىٰ القلم، فقال له: أُكتب، قال: ياربّ، وما أُكتُبُ؟ قال: أُكتب مقاديرَ كلِّ شيء حتى تقوم الساعة.**" اسی قلم کی قسم اللہ نے قرآن کریم میں کھائی ہے۔ ﴿**نٓ والقلم ومايسطرون**﴾[القلم: ١]

(أخرجه ابوداؤد والترمذي في السنة: باب القدر)

وبجميع مافيه: أي ونؤمن بجميع مافيه.

فَلَوا اجْتَمَع الخلق كلُّهم على شيءٍ ،كتبه الله تعالىٰ أنه كائنٌ، ليجعلوه غيرَ كائن، لم يقدروا عليه ، ولواجتمعوا كلهم على شيء كتبه اللّٰه تعالىٰ فيه أنه غير كائن ليجعلوه كائنًا، لم يقدروا عليه ، جَفَّ القلم بما هو كائن إلى يوم القيامةِ وما أخطاء العبد لم يكن ليُصيبه وما آصابه لم يكن ليُخطئه.

پس اگر جمع ہوجائے پوری مخلوق کسی ایسی شی پر جس کو اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے کہ یہ ہوگی تاکہ وہ مخلوق اس کو نہ ہونے والی بنادے تو وہ اس پر قادر نہ ہوں گے اور اگر ساری مخلوق کسی ایسی چیز پر جمع ہوجائے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس میں نہیں لکھا تاکہ وہ مخلوق اس کو ہونے والی بنادے تو وہ اس پر قادر نہیں ہوں گے، اور جو چیز بندہ سے چوک گئی، (یعنی اس تک نہیں پہنچی) وہ اس کو پہنچ نہیں سکتی تھی اور جو چیز اس کو پہنچی ہے وہ اس سے چوک نہیں سکتی تھی۔

اس طرح کا مضمون حدیث میں ہے:"عن ابن عباس رضي اللّٰه عنهما قال: كنتُ خلف النبي ﷺ يومًا، فقال : "ياغلام! ألا أُعلِّمك كلمات :احفَظِ الله يحفظْك. (تم اللہ کو یاد رکھو، اللہ تم کو یاد رکھیں گے۔) احفَظِ اللّٰه تجدهُ تُجاهَك. (تم اللہ کو یاد رکھو گے تو اس کو ہر حال میں اپنے سامنے پاؤ گے۔) إذا سئلْتَ فاسْأل اللّٰه، وإذا استعنتَ فاستعِنْ باللّٰه، واعلَم أن الأمّةَ لو اجتمعت على أن يّنفعوك بشيء، لم ينفعوك إلّا بشيء قد كتبه اللّٰه عليك، رُفعت الأقلام، وجفّتِ الصُّحفُ. (أخرجہ الترمذي في صفة القيامة)

امام طحاویؒ کے قول کے "وما أخطا العبد ..." کا مضمون، دوسری روایت میں ہے "واعلم أنَّ ما أخطأك لم يكن ليُصيبك، وما أصابك لم يكنْ ليُخطئك." (مسند احمد)

وَعَلَى العبد أن يَعلمَ أنّ اللّٰه قد سبق علمُه في كل كائن من خلقه فقدَّر ذلک تقديرا مُحكمًا مُبرمًا. ليس فيه ناقضٌ، ولامعقِبٌ، ولامُزِيل، ولامغيِّرٌ ،ولا مُحوِّلٌ، ولاناقصٌ، ولازائدٌ من خلقه في سماواته ،وأرضه.

بندہ پرواجب ہے کہ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جان لیں کہ اللہ تعالیٰ کا علم اس کی مخلوق میں سے ہر ہونے والی چیز سے مقدم ہو چکا ہے، اور اسے مضبوط اور نہ ٹلنے والی تقدیر سے مقدر کیا ہے، اس تقدیر کو آسمان اور زمین کی مخلوقات میں سے نہ کوئی توڑ سکتا ہے اور نہ ہی کوئی ملتوی کرنے والا ہے اور نہ کوئی زائل کرنے والا ہے اور نہ کوئی ادلنے بدلنے والا ہے اور نہ کوئی اضافہ کرنے والا اور نہ کوئی گھٹانے والا ہے۔

حدیث: ”قدّر اللّٰه مقادير الخلق قبل أن يخلق السمٰوت والأرض بخمسين ألف سنة وعرشه على الماء. “ کی روشنی میں یہ بات طے ہے، کہ جو کچھ کائنات میں ہو رہا ہے وہ پہلے سے اللہ تعالیٰ نے مقدر کر رکھا ہے، یہاں اب فرماتے ہیں کہ: جو کچھ کائنات میں ہو رہا ہے وہ پہلے سے اللہ تعالیٰ کے علم میں بھی ہے، اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ اشیاء اپنے مخصوص اوقات میں موجود ہوں گی اور ہوتا بھی ایسا ہی ہے۔ ”فيثبت علمه القديم وفي ذلک الرّدعلى من ينكر علمه القديم. “

غالی قسم کے معتزلہ اس بات سے (کہ اللہ ازل میں عالم تھا) انکار کرتے ہیں۔
وقالوا: إنّ اللّٰه تعالىٰ لايعلم أفعال العباد حتى يفعلوا، تعالىٰ اللّٰه عمّا يقولون عُلوًّا كبيرًا.

نوٹ: تقدیر دو قسم پر ہیں۔ایک بدلتی ہے اور ایک نہیں بدلتی جو تقدیر بدلتی ہے، اس کو معلّق اور جو نہیں بدلتی اس کو مُبرم کہتے ہیں، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو عمر یا رزق وغیرہ کسی کے تقدیر میں لکھ دیئے ہیں، وہ بعض اعمال کی وجہ سے کم یا زیادہ ہوسکتے ہیں، اور دعاء کی وجہ سے بھی تقدیر بدلی جاسکتی ہے، اس طرح کی تقدیر معلّق کہلاتی ہے، لیکن اہل علم فرماتے ہیں کہ: معلق اور مبرم محض تقسیم ظاہری ہے (جو بندوں کے اعتبار سے ہے) ورنہ دراصل تقدیر مبرم ہی ہوتی ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر تقدیر مبرم ہی

ہے) کیونکہ تقدیر کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی تجویز کو وہ بدل ہی نہیں سکتی اگر کوئی تقدیر معلق ہو دعاء پر اور دعاء سے اس کا وقوع ہو گیا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ تقدیر میں بھی تھا کہ دعاء بھی ہوگی اور اس سے بلا جاتی رہے گی یا مثلاً تقدیر میں یہ ہو کہ دوا کرے گا تو اچھا ہوگا، لیکن یہ واقعہ کہ کرے گا یا نہیں یہ تو مبرم ہی ہے، لہٰذا تقدیر دراصل مبرم ہی ہوتی ہے۔ (ملفوظات اشرفیہ)

نوٹ: بعض دفعہ لوگ سوچتے ہیں کہ جب ہر کام مقدر من اللہ ہے، تو پھر تدابیر اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور ایمان واعمال سے کیا ہوگا؟ یہ سوچنے کا انداز درست نہیں، کیونکہ تقدیر اپنی جگہ اٹل حقیقت ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ تدبیر اور کسب اختیار کرنا جائز ہے، کیونکہ تقدیری نظامِ مخفی ہے (کسی کو علم نہیں کہ اس کے بارے میں کیا لکھا ہے جب علم نہیں تو اچھے اعمال ہی کرنے چاہئے) اور تشریعی نظام ظاہر ہے جس کا انسان مکلف ہے، مثلاً کفر و شرک اور چوری وغیرہ اختیاری افعال ہیں، ان میں تقدیر کا حوالہ دینا درست نہیں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک چور نے چوری کر کے تقدیر کا سہارا لیکر کہا کہ: "الله قدرلي هذا" حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے چور کا ہاتھ کاٹ کر اس کو کوڑے بھی لگوائے اور فرمانے لگے: "القطع للسرقة والجلد للكذب على الله" (حاشية الإبانة. عن أصول الديانة) دوسری بات یہ ہے کہ دنیا کے بارے میں کوئی یہ سوچ کر کہ جو کچھ مقدر ہے وہی ملے گا، اسبابِ حصول زرق ترک نہیں کرتا، پھر آخرت کے بارے میں یہ منفی رویہ کیوں ہے؟

وذلک من عقد الإيمان، وأصول المعرفة والاعتراف بتوحيد الله تعالیٰ وربوبيته كماقال تعالیٰ فی كتابه: ﴿وخَلَقَ كُلَّ شيءٍ فقدّر تقديرًا.﴾ (الفرقان: ٢) وقال تعالیٰ: ﴿وكان أمر الله قَدرًا مقدورا﴾ (الاحزاب:٣٨)

مذکور حقائق کو ماننا ایمان کی پختگی، معرفت کی بنیاد، توحید باری تعالیٰ اور اس کی ربوبیت کا اعتراف ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ارشاد فرمایا: "اور اس نے ہر چیز پیدا کر کے ٹھیک اندازہ پر رکھی اور اللہ کا حکم مقدر ہو چکا تھا۔"

وذلک: الإشارة إلی ما تقدم من الإيمان بالقدر وسبق علمه

بالكائنات قبل خلقها. عقد الإيمان : من إضافة الصفة إلى الموصوف أي الإيمان المعقود عليه بالإيقان، والاعتراف: بالرّفع،عطفًا على المصدر المتأول من أن يّعلم۔أي الواجب العلم والاعتراف.

فويلٌ لمن صار لله في القدر خصيمًا وأحضر للنظر فيه قلبًا سقيمًا. لَقَدِ التمس بوهمه في فحص الغيب سرًّا كتيمًا، وعاد بما قال فيه أفّاكًا أثيماً.
تو بربادی وہلاکت ہے اس شخص کے لئے جو تقدیر کے معاملے میں اللہ تعالیٰ سے جھگڑا کرنے والا ہوگیا اور جس نے تقدیر میں غور وفکر کے لئے بیمار دل کو حاضر کیا وہ اپنے وہم وگمان کے مطابق غیب کی جستجو میں پوشیدہ رازہائے خداوندی کو تلاش کرنے لگا اور اس طرح تقدیر کے کے بارے میں جو کچھ اس نے کہا جھوٹا اور گنہگار ٹھہرا۔

لقدالتمس ...: ماقبل کی علت ہے. أي: طلب بوهمه في البحث عن الغيب سرًا مكتومًا. حاصل یہ کہ "القدر سرّ الله في خلقه" کا قاعدہ مسلّم ہے، لیکن جب کوئی شخص اس رازہائے خداوندی کو تلاش کرنے لگا تو گویا وہ "اطلاع على الغيب" کا قصد وارادہ کرتا ہے، حالانکہ ارشاد ہے کہ: ﴿عالم الغيب فلا يُظهر علىٰ غيبه أحدًا.﴾ (الجن :۲٦)عاد بما قال فيه : أي في القدر. أفّاكًا: كذابًا. أثيمًا: أى مأثوماً.

عرش وکرسی

والعرش والكرسي حقٌّ.
عرش الٰہی اور کرسی برحق ہیں۔

العرش: في اللّغة:عبارة عن السّرير الّذي للملك. جیسے بلقیس کے تخت کے بارے میں فرمایا: ﴿ولها عرش عظيم﴾[نمل]

یہاں اس سے کیا مراد ہے؟ تو جاننا چاہیے کہ "عرش" کے متعلق نصوص سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ عرش ایک عظیم جسم ہے جو زمین وآسمان سے بہت بڑا ہے، عرش کے پائے ہیں اور خاص فرشتے ان پایوں کو اٹھانے والے ہیں اور آسمانوں کے اوپر عام عالم کے لئے ایک قبہ کی طرح ہے اور یہ تمام مخلوقات کی چھت ہے۔ بیضاوی نے اس کی تفسیر اس

طرح کی ہے۔"والعرش :"الجسم المحيط بسائر الأجسام سمي به لارتفاعه أو للتشبيه بسرير الملك. " سورۃ طٰہٰ کی آیت ﴿الرحمن على العرش استوىٰ﴾ کے تحت صاحب روح المعانی علامہ آلوسیؒ نے "عرش" کے بارے میں نہایت تفصیلی کلام کیا ہے۔ "من شاء فليراجعه"۔

الكرسي: بضم الكاف. مستند روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کرسی بھی عظیم الشان جسم ہے جو تمام آسمان اور زمین سے بدرجہا بڑا ہے، کرسی اتنی بڑی ہے، جس کی وسعت کے اندر ساتوں آسمان اور زمین سمائے ہوئے ہیں کماقال تعالیٰ: ﴿وسع كرسيّه السمٰوت والأرض﴾ (البقرة: ٢٥٥) اور عرش پھر کرسی سے بھی بڑا ہے، کیونکہ کرسی کی حیثیت عرش کی بنسبت ایسی ہے، جیسے ایک بڑے میدان میں انگوٹھی کا حلقہ پڑا ہو۔

والصحيح أنّ الكرسي غير العرش نقل ذلك عن ابن عباس رضي الله عنهما وغيره"

علامہ میدانیؒ نے کرسی کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: "وهو جسم نوراني بين يدي العرش ملتصق به "

وهو مُسْتَغْنٍ، عَنِ الْعَرْشِ وَمَادُوْنَهُ، مُحيطٌ بكل شيءٍ وفوقهُ، وقد أعجز عن الإحاطة خلقَه.

اللہ تعالیٰ عرش اور اس کے علاوہ دیگر چیزوں سے بے نیاز ہے، اللہ تعالیٰ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے اور سب پر غلبہ اور برتری رکھتا ہے اور اس نے مخلوق کو اپنے احاطے سے عاجز کردیا۔

امام ابوحنیفہؒ اپنی کتاب "الوصية" میں فرماتے ہیں: "نقرّ بأنّ الله على العرش استوىٰ من غير أن يكون له حاجة إليه، واستقراره عليه، وهو الحافظ للعرش، وغير العرش، ونِعم ما قال الإمام مالك رحمه الله حيث سئل عن ذلك الاستواء فقال: "الاستواء معلوم، والكيف مجهولٌ والسؤال عنه بدعة والإيمان به واجب." (شرح الفقه الأكبر وسير أعلام النّبلاء: ٨/ ١٠٠) حاصل یہ کہ اللہ تعالیٰ عرش کا خالق ہے اور عرش پر مستوی ہے، (كما

يليق بشانه) لیکن یہ خلق اور استواء اس وجہ سے نہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش کا محتاج ہے، بلکہ اس میں اللہ کی حکمت ہے۔ ایک نسخہ میں لفظ آیا ہے "وبما فوقه" أي محيط بما فوق كل شيء وبما تحته وبما والاه ۔ اس صورت میں مطلب واضح ہے، لیکن ایک دوسرے نسخہ میں ہے وفوقه :أي أنه سبحانه محيط بكل شيء وفوق كل شيء أي فوق المخلوقات. اب اس صورت میں اللہ کے لئے فوقیت اور علو کا ثبوت ہوگا، مگر یہ مکان اور جہت کو مستلزم نہیں، فوقیت بدون الجهة ہے۔ اللہ امکنہ پر محیط ہے، خود مکانی نہیں اگر اس سے کوئی جہت "فوق" ثابت کر دیں پھر تو اللہ محاط ہوگا اور وہ جہت ومکان محیط۔ "فتعالیٰ الله عن الجنس والجهات." "قرآن کریم میں جہاں اللہ کے لئے "فوق" کا لفظ استعمال ہوا ہے مفسرین نے اس کے معنیٰ "بالا دستی، غلبہ اور برتری" سے کیے ہیں اور بعض نے متشابہات سے قرار دیا۔

فائدہ: وليس المراد من إحاطته بخلقه أنه كالفلك، وأنّ المخلوقات داخل ذاته المقدسة وانما المراد: إحاطة عظمةٍ، ووسعةٍ، وعلمٍ، وقدرةٍ. وقد أعجز عن الإحاطة خلقه: أي لايحيطون به علمًا ولا رؤيةً ولاغير ذلك من وجوه الإحاطة.

غرض یہ کہ کوئی چیز اللہ کا احاطہ نہیں کر سکتی، ورنہ مُحاط کا محیط ہونا لازم آئے گا۔

"سبحان من لايبلغ الواصفون وصفه، ولايقدر أحدقدره"

> ونقول: إنّ الله اتّخذ ابراهيم خليلاً، وكلّم موسىٰ تكليمًا إيمانًا وتصديقًا وتسليمًا.
>
> پورے ایمان، صدق دل اور تسلیم ورضاء سے ہم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خالص دوست بنایا اور موسیٰ علیہ السلام سے باتیں کی۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿واتخذ الله إبراهيم خليلاً﴾ (نساء :١٢٥) اللہ تعالیٰ نے بنالیا ابراہیم علیہ السلام کو خالص دوست۔

الخُلّة: كمال المَحبة. خلیل کے معنیٰ ہیں کہ جس کے دل میں محبت اس طرح راسخ ہوجائے کہ کسی اور کے لئے اس میں جگہ نہ رہے۔ خلیل بروزن فعیل بمعنیٰ فاعل ہے

جیسے علیم بمعنی عالم۔اور بعض کہتے ہیں: بمعنی مفعول ہے جیسے حبیب بمعنی محبوب اور حضرت ابراہیم علیہ السلام یقیناً اللہ کے محبّ بھی تھے اور محبوب بھی۔(فتح القدیر) ''خُـلّة'' کے اس مرتبہ میں ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ساتھ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک ہیں، چنانچہ حدیث میں ہے: ''لو كنت متخذًا من أهل الأرض خليلاً، لاتّخذتُ أبابكر خليلاً ولكنّ صاحبَكم خليلُ الله.'' (بخاري في خلق أفعال العباد)

یعنی حضور ﷺ خود خلیل اللہ ہیں، ''وفي روايةٍ إنّ الله اتخذني خليلاً كما اتخذ ابراهيم خليلاً.''

موسیٰ علیہ السلام کے کلیم اللہ ہونے کے بارے میں فرمایا: ﴿وكلّم الله موسىٰ تكليما﴾ (نساء:١٦٤)

اور موسیٰ علیہ السلام سے اللہ نے صاف طور پر کلام کیا (واضح رہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے مشافہۃً کلام نہیں سنا، بلکہ پس پردہ صرف آواز سُنی) یہ موسیٰ علیہ السلام کی وہ خاص صفت ہے جس میں وہ دوسرے انبیاء علیہم السلام سے ممتاز ہیں، لیکن اس مرتبہ ''تکلم'' میں بھی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ساتھ آنحضرت ﷺ بھی شریک ہیں۔ كما ثبت ذلك في حديث الإسراء '' بلکہ ابن کثیر نے اس صفت ہم کلامی میں حضرت آدم علیہ السلام کو بھی شریک مانا ہے (ابن کثیر زیر آیت ﴿تلك الرسل فضلنا بعضهم على بعض﴾.

جہمیہ نے حقيقة المحبة من الجانبين اور حقيقة التكليم دونوں سے انکار کیا، چنانچہ انہوں نے اس کا انکار کیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ ہوں یا موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ ہوں۔

فرشتوں، پیغمبروں اور کتابوں پر ایمان

ونُؤْمِنُ بالملائكة، والنّبيّين، والكُتب المنزَّلة على المرسلين، ونشهد أنهم كانوا على الحقِّ المبين.

ہم فرشتوں، انبیاء علیہم السلام اور رسولوں پر نازل کی گئی تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں اور اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ تمام انبیاء علیہم السلام کھلے حق پر تھے۔

مندرجہ بالا پانچ امور، ارکان ایمان کہلاتے ہیں ، قال ابو طالب المکی رحمہ اللّٰہ : أركان الإيمان سبعة، يعني هذه الخمسة والإيمان بالقدر، والإيمان بالجنة والنار. "بقیہ تین کا ذکر امام طحاویؒ آگے فرمائیں گے۔

ملائکہ کی تعریف

''الملائكة أجسام لطيفة تظهر في صور مختلفة وتقوى على أفعال شاقة؛ هم عباد مكرمون يواظبون على الطاعة والعبادة، ولايوصفون بالذكورة والأنوثة." (شرح المقاصد: ۳/ ۳۱۹) فرشتوں پرایمان لاناضروری ہے فرشتوں کا انکار کرنے والا مؤمن نہیں، ایسے ہی تمام انبیاء اور مرسلین پر ایمان لانا ضروری ہے، اللہ تعالیٰ پر ایمان اس شخص کا معتبر ہے جوانبیاء کرام پر ایمان رکھتا ہے۔جن آسمانی کتابوں اور صحیفوں کا ثبوت دلائل قطعیہ سے ہے،ان پر بھی ایمان لاناضروری ہے۔

> **ونُسمّي أهلَ قِبلَتِنا مُسْلِمين مؤمِنين، مادامُوا بما جاء به النبي ﷺ معترِفين، وله بكل ما قال وأخبر مصدِّقين غيرَ مكذِّبين.**
>
> ہم اہل قبلہ کواس صورت میں مسلمان ومؤمن سمجھتے ہیں، جب تک وہ اس دین پر قائم رہیں، جو رسول اکرم ﷺ لیکر آئے ،اوراس دین کا اعتراف کریں،اور جو کچھ آپ نے فرمایا اور جس کی خبر دی اس کی تصدیق کرتے ہیں، نہ کہ تکذیب اور آپ کی تمام باتوں اور احادیث کو سچے دل سے تسلیم کرتے ہیں۔

اہل قبلہ کی تعریف

اولاً یہ سمجھئے کہ ضروریات دین سے مراد یہ ہے کہ وہ مسئلہ ایسا ہو کہ ہر وہ شخص جسے کچھ بھی دین سے تعلق ہو،اس کو من الدین سمجھتا ہو،یعنی وہ اسلام کے اجلی البدیہیات مسائل سے ہو اب اہل قبلہ کی تعریف سمجھئے اہل قبلہ وہ کہلائیں گے جوتمام ضروریات دین (مثلاً حدوث عالم،حشر الاجساد،علم اللہ بالکلیات والجزئیات اورختم نبوت وغیرہ) پرایمان رکھتے ہوئے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہوں، اہل قبلہ کاقطعاً یہ مطلب نہیں کہ جوبھی شخص صرف قبلہ رُخ ہوکرنماز پڑھتا ہو، چاہے وہ کسی قطعی حکم کا منکر بھی کیوں نہ ہو، کیونکہ قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز تو مسیلمہ کذاب

بھی پڑھتا تھا۔ الغرض اگر کوئی کسی بھی ایک امر ضروری کا انکار کردے تو وہ اہل قبلہ نہ ہوگا اسی طرح مؤوِّل کو کافر نہیں کہنا چاہئے، لیکن مؤوِّل اگر تاویل کرتے ہوئے قطعیات (جو ضروریات دین سے ہو) کا انکار کردے تو ایسا مؤول کافر ہو جائے گا۔ لفظ "مؤمنین ومسلمین" لا کر امام طحاویؒ نے ایمان اور اسلام کے ترادف اور اتحاد کی طرف اشارہ کیا۔

ولا نخُوض في الله، ولانُماري في دين الله.

ہم ذات خدا میں سوچ و بچار نہیں کرتے اور نہ ہی اللہ کے دین میں جھگڑتے ہیں۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی روایت ہے فرمایا: "لاينبغي لأحد أن ينطق في ذات الله بشيء، بل يصفه بماوصف به نفسه" (شرح عقیدۃ الطحاویہ للمیدانی)

"ولانماري في دين الله" علامہ میدانی نے اس کا مطلب لکھا ہے: أي "لانداهن في دين الله" اللہ کے دین میں ہم بے پرواہی اور مداہنت سے کام نہیں لیتے ہیں، ابن ابی العزؒ اس کی شرح میں فرماتے ہیں: "لانخاصم أهل الحق بإلقاء شبهات أهل الأهواء عليهم، التماسًا لامتراء هم وميلهم، لأنه في معنى الدعاء إلى الباطل، وتلبيس الحق، وإفساد دين الاسلام" بہرحال "الخوض في الله" اور "المماراة في الدين" دونوں منع ہیں۔

و لانجادل في القرآن و نشهد أنه كلام رب العالمين نزل به الروح الامين، فعلّمه سيدَ المرسلين محمدًا ﷺ وعلىٰ اٰله أجمعين وهو كلام الله تعالىٰ، لايُساويه شيء من كلام المخلوقين، ولانقول بخلقه ولانخالف جماعة المسلمين.

ہم قرآن کے ظاہری معانی میں جھگڑا نہیں کرتے، بلکہ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ سارے عالم کے پروردگار کا کلام ہے، جبریل علیہ السلام اسے لیکر نازل ہوئے اور سارے نبیوں کے سردار ﷺ کو یہ کلام سکھلایا، بلاشبہ یہ کلام الٰہی ہے، مخلوق کا کلام اس کے مساوی نہیں ہوسکتا نہ ہی ہم اللہ کے کلام کو مخلوق کہتے ہیں اور نہ مسلمانوں کی جماعت کی مخالفت کرتے ہیں۔

ولانجادل ... اس جملہ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ (۱) **لانقول في القرآن كما قال أهل الزيغ واختلفوا وجادلوا بالباطل ليدُحضوا به الحق، بل نقول إنه كلام رب العالمين إلى آخر كلامه (۲) أنا لانجادل في القراء ات الثابتة بل نقرؤهُ بكل ماثبت وصح. الروح الأمين : هو جبريل** عليه السلام**، سمي روحًا، لأنه حامل الوحي الّذي به حياة القلوب وسمي أمين، لأنه أمين حق أمين. فعلمه** : یعنی جبریل علیہ السلام نے حضور ﷺ کو قرآن کی تعلیم دی، یہ دراصل قرامطہ وغیرہ کی تردید ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ اللہ کے رسول نے الہام کے طور پر اپنے دل ہی دل میں قرآن کے مضامین کا تصور کیا۔ **وهو كلام الله لايساويه** ....: کلام اللہ چونکہ رب العالمین کی صفت ہے اور یہ حقیقت ہے کہ "**أن من شبّه من صفات الله بشيء من صفات المخلوقين، كان من الكافرين. ولا نقول بخلق القرآن: لأن الخلق صفة المحدث العديم والقرآن كلام الله قديمٌ. جماعة المسلمين : أي يجب علينا أننا لانخالف السواد الأعظمَ أهل السنّة والجَماعة في جميع ما اتفقوا عليه، فإن خلافهم زيغٌ ،وضلالٌ، وبدعةٌ وفيه تنبيهٌ على أن من قال بخلق القرآن فقد خالف جماعة المسلمين.**

نوٹ: مسلمانوں کی جماعت سے پاکستان کی "جماعۃ المسلمین رجسٹرڈ"، جس کی داغ بیل تیس سال قبل ڈاکٹر مسعود احمد صاحب نے ڈالی، مراد نہیں، بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور تبع تابعین کی جماعت مراد ہے، جس کی تعبیر اہل السنّت والجماعۃ سے کی جاتی ہے اور یہ دراصل "**ماأنا عليه وأصحابي**" سے ماخوذ ہے۔ دراصل لامذہب (غیر مقلدین) سے الگ ہو کر مسعود احمد نے صرف پاکستان کی سطح پر شرذمہ قلیلہ "جماعۃ المسلمین پاکستان" کو رجسٹرڈ کروا کر ساری دنیا کے مسلمانوں کو غیر مسلم اور خارج از اسلام قرار دیا اور بجائے فرقہ واریت کے خاتمہ کے ایک نئے فرقہ نے جنم لیا، صرف نام رکھ لینے سے کچھ نہیں بنے گا جس طرح بدعتی حضرات نے اپنے آپ کو سنی کہنا شروع کر دیا ہے، لیکن سنی نام رکھ لینا اور سنت کی خلاف ورزی کرنا آخرت میں ہرگز مفید نہیں ہوگا۔ اسلام اور مسلمین کی صفت سے حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی وغیرہ متصف ہیں، موجودہ مسعود احمد کی

پارٹی جعلی جماعۃ المسلمین ہے۔

ولانکفِر أحدًا من أهل القلبة بذنب مالم يستحلّه ولانقول: لايضر مع الإيمان ذنب لمن عمله.

جب تک اہل قبلہ (مسلمان) کسی گناہ کو عقیدے کے اعتبار سے جائز وحلال نہیں سمجھتے، ہم انہیں کافر قرار نہیں دیتے اور ہم یہ نہ کہیں گے کہ ایمان کے ساتھ کوئی گناہ مضر نہیں، اس شخص کے لئے جس نے گناہ کیا۔

خوارج اور مرجئہ افراط وتفریط کے شکار ہیں، چنانچہ خوارج ہر گناہ کے مرتکب کو کافر قرار دیتے ہیں، جبکہ مرجئہ کسی قسم کا گناہ ایمان کے لئے مضر نہیں سمجھتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ: "حسناتنا مقبولة وسيّاتنا مغفورة" ولانكفر: سے خوارج اور ولانقول :"لایضر" سے امام طحاویؒ نے مرجئہ کی تردید کی طرف اشارہ کیا۔ اہل السنۃ والجماعۃ عاصی اور فرمانبردار کے لئے عقاب وثواب قطعی اور یقینی نہیں سمجھتے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر چھوڑتے ہیں۔

نوٹ: کسی بدعملی اور گناہ سے مسلمان کافر نہیں ہوتا، لیکن ایسی بدعملی جو امارات کفر وعلامات تکذیب ہو، آدمی کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتی ہے۔ مثلاً بت کو سجدہ کرنا، قرآن کریم کو نجاست میں ڈالنا یا پاؤں سے روندنا کفر ہے۔ (شرح عقائد: ۹۰)

ونرجوا للمحسنين من المؤمنين، أن يعفو عنهم ويُدخلهم الجنة برحمته ولا نأمنُ عليهم، ولا نشهد لهم بالجنة ونستغفر لمُسيئهم ونخاف عليهم ولانُقنّطهم.

ہم مؤمنین میں سے نیک لوگوں کے بارے میں امید رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمادے گا اور انہیں اپنی رحمت سے جنت میں داخل فرمائے گا اور ہم ان پر بے خوف نہیں ہیں، لیکن جنت میں یقینی داخلے کی ہم گواہی نہیں دیتے، ہم گنہگاروں کے لئے بخشش کی دعاء کرتے ہیں ہمیں ان کے متعلق ڈر ہے، لیکن ہم انہیں مایوس نہیں کرتے۔

نیک لوگ باوجود غایت قرب کے ان کی امیدیں محض حق تعالیٰ کی مہربانی سے وابستہ رہنی چاہئے اور اسی کے عذاب سے ہمیشہ لرزاں وترساں رہنا چاہئے، اس

لئے تو کہا گیا ہے کہ "الإیمان بین الخوف و الرّجاء" منافق اور گنہگار شخص برائی کے ارتکاب کے باوجود اللہ کے عذاب سے بے خوف رہتا ہے، حالانکہ اس کو چاہئے کہ اپنے بارے میں ڈرے، مگر اللہ سے مایوس بھی نہ ہو۔ لانأمن علیهم :أي ولٰكن لانأمن علیهم مکر الله تعالیٰ إذ لایأمن مکر اللّٰه إلاالقوم الخاسرون" یعنی اللہ تعالیٰ کے عذاب کے سلسلے میں ہم ان پر بے خوف نہیں، کیونکہ خسارہ کرنے والے لوگ ہی اللہ کے عذاب سے بے خوف ہوتے ہیں۔ لانقنّطهم: لیکن ہم انہیں مایوس نہیں کرتے۔إذلاییأس من روح اللّٰه إلا القوم الکافرون.قال أبو علی الرُّوذ باری رحمه اللّٰه :"الخوف و الرّجاء کجناحی الطائر إذا استویا، استوی الطیر، وتم طیرانه و إذانقص أحدُهما وقع فیه النقص وإذا ذهبا، صار الطائر في حدالموت" اسی کو آگے امام طحاویؒ فرماتے ہیں۔

وَالأَمْنُ وَالإِیَاسُ یَنقُلان عن ملّةِ الإسلام وسبیلُ الحق بینهما لأهل القبلة.

بے خوفی اور مایوسی ملت اسلام سے مٹا دیتی ہے، اہل قبلہ اور مسلمانوں کے لئے سیدھا رستہ ان دونوں کے درمیان ہے۔

الأمن : یعنی اللہ کے عذاب سے بے خوفی۔ والإیاس : اللہ کی رحمت سے مایوسی۔

وسبیل الحق :أي وسبیل القول الحق ما بینهما وهو القول لأهل القبلة.

ولایخرج العبد من الإیمَان إلا بِجُحُود ما أدخله فیه.

بندہ مومن ایمان کے دائرہ سے اس وقت تک نہیں نکل سکتا جب تک کہ ان باتوں کا انکار نہ کردے جن کی بناء پر ایمان میں داخل ہوا تھا۔

امام طحاویؒ نے اس عبارت میں خوارج اور معتزلہ کی تردید کی ہے، جن کا مسلک یہ ہے کہ مرتکب کبیرہ ایمان سے خارج ہوجاتا ہے (خوارج کے ہاں ایمان سے خارج ہوجانے کے بعد کفر میں داخل ہوتا ہے، جبکہ معتزلہ کا خیال یہ ہے کہ ایمان سے تو نکل جاتا ہے، مگر کفر میں بھی داخل نہیں ہوتا، اس حالت کو وہ "منزلة بین المنزلتین" سے تعبیر کرتے ہیں)۔

إلابجحودما: أي الَّذي أدخله فيه : "أدخل" کی ضمیر فاعل بسوئے ما موصولہ ہے، "ہ" کی ضمیر مفعول "عبد" کی طرف راجع ہے، فیه کی ضمیر مجرور، ایمان کی طرف لوٹ رہی ہے۔ غرضیکہ قطعیات میں سے ضروریات دین کا انکار کئے بغیر بندہ ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔

نوٹ: مصنفؒ بر بناء تقریر و تاکید ایک ہی عقیدہ کو مختلف الفاظ و اسلوب میں بیان فرمادیتے ہیں، تاکہ "أوقع في الذهن" ہوجائے۔

وَالإِيْمانُ هُو الإقرار باللِّسانِ وَالتَّصديقُ بالجَنان.
ایمان زبان سے کہنے اور دل سے سچا ماننے کا نام ہے۔

"ایمان" باب افعال سے ہے، جو "أمن" سے ماخوذ ہے۔

الإيمان في الأصلِ جعُل الغير امنا ثم وضع للتصديق ،لأن المُصدَّق كأنّه يجعل المُخبر امنًا من التكذيب والمخالفة.

ایمان کی شرعی تعریف: (۱) متن میں امام طحاویؒ نے امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب سے جو تعریف نقل کی ہے، یہ ایمان کی شرعی تعریف ہے، اس تعریف کی تشریح بالفاظ دیگر یوں ہے: "الإيمان في الشرع هو تصديق النبي ﷺ بالقلب في جميع ماجاء به من عند الله تعالىٰ والإقرار بجميع ماجاء به النبي ﷺ" گویا اس تعریف کی رُو سے ایمان کا تعلق قلب اور لسان سے ہے، یعنی یہ دونوں ایمان کے رکن ہیں۔

(۲) مگر شیخ ابومنصور ماتریدی کا کہنا یہ ہے کہ: "إن الإقرار باللسان ركنٌ زائدٌ ليس بأصلي فالإيمان هو التصديق بالقلب وإنما الإقرار شرط لإجراء الأحكام في الدنيا من حرمة الدم، والمال، وصلوٰة الجنازة عليه، ودفنه في مقابر المسلمين "بعض حضرات کا خیال ہے کہ: امام ابوحنیفہؒ کا بھی یہی مسلک ہے، اس مذہب کی رو سے ایمان کا تعلق صرف قلب ہی سے ہے، زبان سے اقرار کرنا اجراءِ احکام اسلام کے لئے شرط ہے، کیونکہ کسی کا مسلمان ہونا زبانی اقرار سے ہی معلوم ہوگا، چنانچہ اگر ایک شخص دل سے تصدیق کرتا ہے اور زبان سے اقرار نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ مسلمان ہے۔

(۳) "ذهب مالکؒ، والشافعیؒ، وأحمدؒ وغیرهم إلى أن الإيمان تصديق بالجنان، وإقرار باللسان، وعمل بالأركان" اس مذہب کی رُو سے ایمان کا تعلق قلب، لسان اور جوارح تینوں سے ہے۔

دلائل اور مزید تفصیل شرح عقائد میں ہے اگلے سال مشکوۃ شریف اور اس سے اگلے سال بخاری شریف میں بھی پڑھ لیں گے۔

> **وجميع ماصحّ عَنِ النّبي صَلّى الله عليه وسلم من الشرع وَالبيانِ كُلُّهُ حقٌّ.**
>
> جو کچھ شرع اور بیان کی باتیں، جن کی نسبت رسول اللہ ﷺ سے درست ہو، سب کے سب حق ہیں۔

اس عبارت میں تعطیل نصوص کی تردید ہورہی ہے، کیونکہ اہل سنت نص صحیح سے عدول نہیں کرتے، جبکہ جہمیہ، معطّلہ، معتزلہ اور روافض وغیرہ ظاہری نصوص کو بسا اوقات معطّل کر کے ظاہر سے عدول کرتے ہیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے ارشادات دو قسم کے ہیں:

(الف) وہ ہیں کہ جن میں ایسے احکام جدیدہ کو مشروع فرمایا کہ جو قرآن میں مذکور نہیں۔

(ب) وہ ہیں جن میں احکام قرآنی کی وضاحت اور تفسیر ہو، امام طحاویؒ نے اپنے قول: "من الشرع والبيان" سے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

> **والإيمان واحدٌ وأهلُه في أصلِه سواءٌ والتفاضل بينهم بالتقوىٰ ومخالفةِ الهوىٰ وملازمة الأولىٰ.**
>
> ایمان واحد ہے اور اس کے اہل (تمام مؤمنین) اس کی اصل (ایمان) میں برابر ہیں، لیکن ایک دوسرے پر برتری تقویٰ، اپنی خواہشات نفسانی کی مخالفت اور اولیٰ وافضل کو لازم پکڑنے کی وجہ سے ہے۔

الإيمان واحدٌ : لأنّ الإيمان التصديق البالغ حد الجزم

والإذعان الَّذي لايقبل التشكيك، والأعمال غير داخلة في حقيقة الإيمان. وأهله: أي أهل الإيمان من الملائكة والأنبياء والأولياء وسائر المؤمنين الأبرار والفجّار. في أصله: الَّذي هو التصديق كلهم فيه. سواء: أي لاتفاضل فيه من حيث ذاته ولايزيد ولاينقص. الحاصل أن التفاوت بين المؤمنين بأعمال القلوب. وأما التصديق فلاتفاوت فيه. قال أبو حنيفة وأصحابه رحمهم اللّٰه: لايزيد الإيمان ولاينقص، واختاره من الأشاعرة إمام الحرمين، وذهب عامتهم إلى زيادته ونقصانه.

غرضیکہ مؤمنین، نفس ایمان میں سب برابر ہیں، ان میں تفاضل اور مراتب ایمانی کا اختلاف، تقویٰ، اخلاص کی زیادتی اور اعمالِ صالحہ کی کمی وبیشی کی بناء پر ہے۔

والمؤمنون كلهّم أولياءُ الرَّحمٰن وأكرمُهُم عنداللّٰه، أطْوعُهم وأتبعُهم للقرآن. سب اہل ایمان، رحمان کے دوست ہیں ان میں سب سے زیادہ عزت والا قرآن کی سب سے زیادہ اطاعت کرنے والا اور زیادہ پیروی کرنے والا ہے۔

الوليّ: من الولاية (بفتح الواو) الّتي هي ضد العداوة. الوليّ: خلاف العدوّ، وهو مشتق من الولْي. وهو الدُّنووالتقرّب، فولي اللّٰه: هو من والي اللّٰه بموافقته في محبوباته. والتقرب إليه بمرضاته. قال صاحب شرح العقائد: الوليّ: هو العارف باللّٰه وصفاته حسب مايمكن، المواظب على الطاعات، المُجتنِب عن المعاصي المُعرِض عن الإنهماك في اللّذات والشهوات.

فالمؤمنون أولياء اللّٰه، واللّٰه تعالىٰ وليُّهم وأما أولياء اللّٰه الكاملون، فهم المَوصوفون في قوله تعالىٰ﴿ ألَا إنَّ أولياء اللّٰه لاخوفٌ عليهم ولاهم يحزنون.﴾[الاية] (يونس٦٢،٦٣)

والإيمان: هو الإيمان بالله وملائكته وكُتبه ورسله واليوم الأخر، والقدرِ خيرِه وشرِّه وحُلوه ومُرّه من الله تعالىٰ.

ایمان نام ہے سچے دل سے یقین کرنے کا اللہ تعالیٰ پر اس کے فرشتوں پر اس کی آسمان کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر اور یہ کہ اچھی بری، میٹھی کڑوی تقدیر اللہ کی طرف سے ہے۔

الإيمان: أي الإيمان المطلوب من المكلّف. هو الإيمان: أي الإقرار مع التصديق والإذعان. بالله: تعالىٰ بأنه موجود بصفاته الواجبة له، منزهًا عمّا يستحيل عليه. وملائكته: بأنهم عباداللّٰه المكرمون، لايعصون اللّٰه ما أمرهم، ويفعلون مايؤمرون وبأنهم سُفُر (فرستادہ) اللّٰهِ بينه وبين خلْقه. وكتبه: بأنها كلام اللّٰه تعالىٰ الأزلي القديم، المنزّه عن الحروف والأصوات، وبأنه تعالىٰ أنزلها على بعض رسله بالفاظ حادثةٍ في ألواح أو على لسان ملك. ورسله: بأنه أرسلهم إلى الخلق لهدايتهم، وأيّدهم بالمُعجزات، وبأنهم معصومون من الصغائر والكبائر قبل النبوة وبعدها. واليوم الآخر: وهو من الموت إلى آخر ما يقع يوم القيامة. وفي بعض النسخ والبعث بعد الموت: فهو إمّا تاكيد لليوم الأخر و إما من عطف الخاص على العام.

وَنَحنُ مُؤْمِنُون بذٰلك كلّه، لانفرّق بين أحدٍ من رُسله ونصدِّقهم كلَّهم علىٰ ماجاؤُا به.

ہم ان تمام باتوں پر ایمان رکھتے ہیں، رسولوں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے اور وہ جو پیغام لائے تھے اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

بذٰلک: سے اشارہ ہے، ان تمام مذکورہ امور کی طرف، جن پر تفصیلی ایمان لانا واجب ہے۔ لانفرق بين أحدٍ من رُسله: أي لانفرق بينهم بأن نؤمن ببعض، ونكفر ببعض، بل نؤمن بهم ونصدّقهم كلَّهم. یعنی یہود ونصاریٰ کی طرح کام نہیں کرتے۔ جیسے یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی

مانا،مگر خاتم الانبیاء ﷺ کو نبی نہ مانا۔ وكذلك لانفرق بين أحدٍ من كتبه.

وأهل الكبائر من أُمَّة محمَّدٍ ﷺ في النار لايُخلَّدون إذا ماتوا وهم موحّدون وإن لم يكونوا تائبين بعد أن لقُوا الله عارفين مؤمنين وهم في مشيئته وحكمه، إن شاء غفرلهم وعفاعنهم بفضله، كما ذكر عزوجلّ في كتابه﴿ ويغفر مادون ذلك لمن يّشاء﴾ و إن شاء عذّبهم في النّار بعدْ له، ثم يُخرجهم منها برحمته، وشفاعة الشّافعين من أهل طاعته، ثم يبعثهم إلٰى جنته؛ وذلك بأن الله تعالىٰ مولٰى أهلِ معرفته، ولم يجعلُهم في الدّارين كأهلِ نُكرته الّذين خابوا من هدايته ولم ينالوا من ولايته. اللّٰهمّ ياوليَّ الإسلام وأهلِه، مسّكنا بالإسلام حتّى نلقاك به.

آنحضرت ﷺ کی امت میں سے کبیرہ گناہ کے ارتکاب کرنے والے جہنم میں جائیں گے،لیکن وہ اس میں ہمیشہ نہیں رہیں گے، درآنحالیکہ موت کے وقت وہ موحدین ہو،اگر چہ کبیرہ گناہوں سے توبہ نہ کی ہو،لیکن اللہ تعالیٰ سے جب ملے ہوں تو توحید باری تعالیٰ کی معرفت اوراللہ کی ذات پر،مؤمن ہونے کی حالت میں ملے ہوں، ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی مشیت اورحکم کے تحت ہوں گے اگر وہ چاہے،توان کو بخش دےاورانہیں اپنے فضل وکرم سے معاف کردے،جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں تذکرہ فرمایا:''شرک کے علاوہ اور گناہ جس کو چاہے معاف کردے''اوراگروہ چاہے تو انہیں جہنم میں اپنے عدل وانصاف کے مطابق سزا دے، پھرانہیں اس سے اپنی رحمت اور اپنے فرمانبردار بندوں کی سفارش کی بناء پرنکال دےاورانہیں جنت میں داخل کردے، یہ اس لئے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کودوست بنایا ہےاورانہیں دنیاوآخرت میں منکرین کے برابر قرارنہیں دیا، جو ہدایت الٰہی سے محروم رہےاوراس کی دوستی کو نہ پاسکے۔اے اللہ!اے اسلام اوراہل اسلام کے دوست!ہمیں اسلام پر ثابت قدم رکھ، حتیٰ کہ تجھ سے اسی حالت میں ملاقات کریں۔

وأهل الكبائر ....: ردّ لقول الخوارج والمعتزلة، القائلين، بتخليدِ أهل الكبائر في النار.

غرضیکہ اللہ چاہے، تو گناہ کو معاف کرسکتا ہے اور اگر چاہے تو گرفت کرسکتا ہے، معاف کرنا اس کا فضل واحسان ہے اور گرفت کرنا اس کا عدل ہے۔

من أمة محمد ﷺ: الإشكال: تخصيصُ أمّة محمد ﷺ، يفهم منه أن أهل الكبائر من أمة غير محمد ﷺ، حكمهم مخالف لأهل الكبائر من أمة محمّد.

الجواب: (۱) ليس في بعض النسخ ذكر الأمة. (۲) المراد جميع أمم الأنبياء عليهم الصلاة والسلام وخصه بالذكر إمّا لاتفاق الحكم في جميع الأمم فإذا عُلم حكم أمته علم الحكم في جميع الأُمم الماضية حيث كانوا كلهم جاؤوا بالتوحيد.

في النار: معمول لقوله: "لايُخلَّدون." عارفين: له بالتوحيد.

مؤمنين: به، فيه رد على الجهمية القائلين بمعرفته فقط وإلاَّ فابليس يعرفه

وشفاعة الشافعين من أهل طاعته: كأنبيائِه ورُسله وأهل معرفته وذلك بإذنه ومشيئته للأحاديث الكثيرة المتواترة. أهل معرفته: أي أهل الإيمان

أهل نكرته: أي الكفار، بأن اللّٰه مولٰى لأهل معرفته: كما قال تعالىٰ: ﴿ذلك بان اللّٰه مولى الّذين امنوا وأنّ الكافرين لامولىٰ لهم﴾

مسّكنا: بعض نسخوں میں اس کی جگہ "ثبتّنا" ہے، دونوں کا مفہوم ایک ہے، یعنی اسلام پر استقامت کی دعاء۔

> ونَرَى الصَّلاة خَلْفَ كُلِّ بَرِّ وفاجِرِ من أهل القبلة، ونصلّي علٰى من مَاتَ منهم.
>
> ہم اہل قبلہ (مسلمانوں) میں سے ہر نیک وگناہ گار امام کے پیچھے نماز پڑھنے کو درست سمجھتے ہیں اور اسی طرح ہر نیک اور گناہ گار کی نماز جنازہ پڑھنا شرعاً جائز سمجھتے ہیں۔

ونرى الصلاة : أي جائزةً. خلف كل بَرِّ :مهتد. وفاجرٍ :مُعتَدٍ حيث كان. من أهل القبلة : لقوله ﷺ :"صلُّوا خلف كلِّ بَرٍّ وَفاجرٍ"(أجرجه البيهقي في السنن والفتح الكبير)ولأن علماء الأمة كانوا يُصلّون خلف الفسقَةِ، وأهل الأهواء،والبدعة من غير نكير و في صحيح البخاري:أن عبدالله بن عمر رضي الله عنهما كان يصلّي خلفَ الحجاج بن يوسف الثقفي، وكذا أنس بن مالك ﷺ، وكان الحجاج فاسقًا ظالماً وما نقل عن بعض السلف من المنع عن الصلاة خلف المبتدع فمحمول على الكراهية، إذ لا كلام في كراهية الصلاة خلف الفاسق والمبتدع وهذا إذا لم يؤد الفسق أوالبدعة إلى حد الكفر وإلافلاكلام في عدم جواز الصلاة خلفه. كذا في شرح العقائد.

ونصلي على مَن مَّات منهم : أي ونرى الصلاة(نماز جنازه) على من مات من الأبرار والفجّاربالشرط المتقدم. حدیث میں ہے:" والصلوٰة واجبة على كل مسلم برا كان أو فاجرا وإن عمل الكبائر." (ابو داؤد، مشكوة، باب الإمامة/ ١٠٠)

البتہ اس عموم سے باغی لوگ ،قُطاع الطریق،اور وہ منافق جس کا نفاق معلوم ہو، مستثنیٰ ہیں، کیونکہ ان پر نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، کیونکہ فقہاء کرام نے ان لوگوں کی نماز جنازہ پڑھنے سے زجراً منع کیا ہے۔ واضح رہے کہ قطاع الطریق اگر عین جنگ کے موقع پر قتل کردیئے جائیں،تو نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔ ورنہ پڑھی جائے گی،خودکشی کرنے والے کی بھی نماز جنازہ پڑھی جائے گی،(الشامي :باب صلاة الجنائز) والدین کے قاتل کو اگر امام نے قصاصاً قتل کیا ہو،تو اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، اگر طبعی موت مرا ہو پھر پڑھی جائے گی۔

ولا نُنزل أحدًا منهم جنةً ولانارًا ولا نشهد عليهم بالكفر ولا بشركٍ ولا بنفاقٍ، ما لم يظهر منهم شيء من ذلک ونذر سرائزهم إلى الله تعالىٰ.

اہل قبلہ میں سے، ہم کسی فرد کو جنتی یا جہنمی قرار نہیں دیتے (قطعی اس کو جنتی یا دوزخی نہیں کہتے) اور نہ ہی کسی پر کفر، شرک یا نفاق کی شہادت دیں گے۔ تاوقتیکہ ان چیزوں (کفر، شرک وغیرہ) کا ان سے ظہور نہ ہو جائے۔ ہم ان کی پوشیدہ باتوں (چھپی ہوئی) کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں۔

يريد: أنا لانقول عن أحدٍ معيّن من أهل القبلة: أنه أهل الجنة أومن أهل النار، لأن حقيقة باطنه، ومامات عليه لانحيط به، لكن نرجو للمحسن، ونخاف على المُسيء (گناہ گار) ولانشهد عليهم ....: لأنا قد أمرنا بالحكم الظاهر ونهينا عن الظنّ واتباع ماليس لنا به علم. ہاں عشرہ مبشرہ وغیرھم کے بارے میں ہم جنتی ہونے کا یقین رکھتے ہیں، کیونکہ ان کی جنتی ہونے کی خبر، خود حضور ﷺ نے دی ہے۔

بہرحال تکفیر کے مسئلہ میں احتیاط کی ضرورت ہے، حدیث پاک ہے: ”من دعا رجلاً بالكفر أوقال عدوّالله وليس كذلک إلا حارّ عليه“ (مسلم ج:۱،ص/۵۷) جس شخص نے کسی مسلمان پر کافر ہونے کا اتہام لگایا، اللہ کا دشمن کہا وہ خود کافر ہو گیا۔

حاصل یہ کہ مسلمان کو کافر کہنے والا خود کافر بن جاتا ہے، مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں، کہ واقعی اور یقینی کافر کو، کافر نہ کہا جائے۔ علامہ انور شاہ کشمیریؒ لکھتے ہیں: ”فليس من الدينْ أن يغمض عن كافر كما ليس من الدين أن يكفر المسلم.“ (إكفار الملحدين: ۵۴)۔ قد اشتهر أن المؤوِّل لا يكفر وهو على ظاهر إطلاقه غير صحيح، فإن المؤوِّل في ضروريات الدين كافر كما صرح به الخيالي.

(معارف السنن: ۱/۴۵۸)

ولانری السيف علی أحدٍ من أمَّة محمد ﷺ إلا من وجب عليه السيف.

ہم امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوۃ والسلام میں سے کسی فرد پر تلوار چلانا جائز نہیں سمجھتے، مگر جس پر تلوار کا چلنا واجب ہو جائے۔

لانری السيف: یعنی خون بہانا واجب نہیں سمجھتے۔ إلامن وجب عليه السيف: أي إلا على من وجب عليه السيف أي سفک الدم بالنص القاطع كالقاتل والزاني المحصن والمرتد. ففي البخاري ومسلم عن ابن مسعود رضي الله تعالیٰ عنه عن النبي ﷺ أنه قال: "لايحل دم امرىٍ مسلمٍ يشهدأن لا إله إلا الله وأني رسول الله إلا بإحدیٰ ثلاثٍ. الثّيب الزاني، والنفس بالنفس والتارک لدينه، المفارق للجماعة. دوسرے موقع پر ایک مؤمن کی جان کی قدر و قیمت دنیا سے بڑھ کر بتائی گئی ہے۔ فرمایا: "قتلُ المؤمن أعظم عند الله من زوالِ الدنيا". (نسائی، جمع الفوائد)

وَلانَری الخروج على أئمّتنا و وُلاة أمورنا وإن جَارُوْا وَلاندعُوا عليهم، ولا نَنزِع يدًا من طاعتهم ونری طاعتَهم من طاعة الله عزوجل فريضة مالم يأمرُوا بمعصيَةٍ وندعوالهم بالصّلاح والمُعافاة.

ہم اپنے ائمہ اور مسلمان حکمران کے خلاف خروج اور بغاوت کو جائز نہیں سمجھتے، اگر چہ وہ ظالم ہی کیوں نہ ہوں اور نہ ہی ہم انہیں بدعا دیتے ہیں اور نہ ہی ان کی اطاعت سے اپنا ہاتھ کھینچتے ہیں، جب تک وہ کسی گناہ کا حکم نہ دیں ہم ان کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت کا حصہ سمجھتے ہیں جو کہ فرض ہے اور ہم ان کے لئے ان کی نیت کی درستگی اور برائی سے بچنے کی دعاء کرتے ہیں۔

کسی ضرورت کے بغیر حکام کی علی الاعلان اہانت شرعاً پسندیدہ نہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت ہے کہ: "لاتشغلوا قلوبكم لسبِّ الملوکِ، ولكن تقرّبوا إلى الله تعالیٰ بالدعاء لهم، يعُطف الله قلوبهم عليكمِ."

اپنے دل بادشاہوں کو برا بھلا کہنے میں مشغول نہ کرو، بلکہ ان کے حق میں دعاء کر کے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرو، اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو تمہاری طرف متوجہ فرمادیں گے۔

(کنز العمال:۶/۲)

بلاوجہ حکومت کی ہر بات میں کیڑے نکالنا اور اس کی کسی اچھائی کا اعتراف نہ کرنا ایسے ہی حکومت کی مخالفت کو بذات خود ایک مقصد بنالینا قطعاً درست نہیں۔امام غزالیؒ نے اس ذہنیت کی تردید کی ہے کہ: ہر مصیبت اور پریشانی پر حکمرنواں کو برا کہتے رہو اور ان کے خلاف تحریکیں چلاتے رہو اور یہ نہ دیکھو کہ خود تمہارا حال کیا ہے؟ یہاں تین باتیں ہیں۔(۱) حکومت عادلہ کے خلاف بغاوت حرام ہے۔(۲) اور اگر حکمران سے کفر بــــوّاح (واضح کفر) کا صدور ہو جائے تو اس کے خلاف بغاوت بالکل برحق ہے، لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ خروج کے لئے مناسب قوت موجود ہو اور اس کے نتیجے میں کسی اور بدتر حکمران کے مسلط ہو جانے یا کسی غیر مسلم طاقت کے قبضہ جمالینے کا اندیشہ نہ ہو۔(۳) اگر حکمران سے فسق وفجور (مثلاً زنا، شرب خمر، بندوں پر ظلم وزیادتی وغیرہ) سرزد ہو اور بندوں پر ظلم وزیادتی کرے پھر بھی ان کی اطاعت وفرمانبرداری کرنی چاہئے ان کے خلاف بغاوت جائز اور مناسب نہیں، کیونکہ سلف نے ایسے حکمرانوں کی طاعت کی ہے۔وجہ اس کی یہ ہے کہ حکمران کے معزول ہونے اور اس کی جگہ دوسرے امام کے تقرر کی صورت میں فتنہ کا اندیشہ ہے، جسے آسانی سے دبایا نہیں جاسکتا۔الغرض فاسق حکمران کا حکم یہی ہے کہ اگر کسی طاعت کا حکم دے تو اس کی اطاعت کی جائے اور معصیت کا حکم دے تو اس کا ساتھ نہ دیا جائے۔کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: ''لاطاعة لمخلوق في معصية الخالق.'' (رواه أحمد وحاكم)

ولاندعوا عليهم: حکمرانوں کے حق میں بددعاء کی ضرورت نہیں، کبھی اللہ تعالیٰ ہمارے بُرے اعمال کی وجہ سے ظالم حکمرانوں کو مسلط کر دیتے ہیں، لہٰذا ارباب حکومت کو کوسنے کے بجائے اللہ کی طرف رجوع ہو۔ جب نادرشاہ نے دلّی کو تاراج کیا اور اور دلّی والوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے، تو اس وقت کے عارف حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ نے فرمایا تھا: ''شامتِ اعمالِ ما صورت نادر گرفت''

ونرى طاعتهم: یعنی امیر کا حکم اگر خلاف شریعت نہیں ہے، تو بہرحال اس کی اطاعت کی جائے، لیکن گناہ میں کسی کی اطاعت نہیں۔

وَنَتَّبِعُ السُّنَّةَ والجماعةَ ونَجْتَنِبُ الشُّذُوْذَ والخلافَ والفُرْقَةَ.
ہم سنت اور جماعت کی پیروی کرتے ہیں اور مسلمانوں کی جماعت سے علیحدگی، مخالفت اور افتراق سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں۔

السنة: طريقة الرسول ﷺ. والجماعة: جماعة المسلمين وهم الصحابة والتابعون.

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''إن هذه الأمة ستفترق علىٰ ثلاثٍ وسبعين ملّةً -يعني الأهواء- كلها في النّار إلّا واحدةً، وهي الجماعة.''
وفي رواية: ''قالوا: من هي يا رسول اللّٰه!؟'' قال: ''ما أنا عليه وأصحابي''
(الترمذي رقم الحديث: ۲۶۴۱)

غرضیکہ اہل سنت والجماعت درحقیقت جماعۃ المسلمین اور اسلام کی اصل روح اور حقیقی تصویر ہے اور اسی نام کے ساتھ اسلام کی خدمت چودہ سو سال سے ہو رہی ہے، مگر صد افسوس! کہ جناب ڈاکٹر مسعود احمد صاحب نے تیس سال قبل تاریخ کے مسلمہ اور مسلمانوں کے امتیازی نام ہٹا کر صرف پاکستان کی سطح پر شرذمہ قلیلہ ''جماعۃ المسلمین پاکستان'' کو رجسٹرڈ کروا کر ساری دنیا کے مسلمانوں کو غیر مسلم قرار دیا۔

ونُحِبُّ أهْلَ العَدْلِ والأمانَةِ، ونُبغِضُ أهْلَ الْجَوْرِ والخِيَانَةِ.
ہم اہل عدل وامانت سے محبت کرتے ہیں، ظالموں اور خیانت کا ارتکاب کرنے والوں سے نفرت کرتے ہیں۔

ونحب ...: یہ دراصل محبت اور بُغض کی حقیقت ہے۔

حدیث پاک: ''من أحَبَّ لِلّٰه وأبغض لِلّٰه وأعطى لِلّٰه ومنع لِلّٰه فقداستكمل الإيمان'' (ابوداؤد) میں یہی بات ذکر ہے۔

ونقول: اللّٰه أعلَمُ، فيما اشتبه علينا علمُه.
اگر کسی چیز کے بارے میں ہمیں شک وشبہ ہو جائے تو ہم اس مقام پر اللہ اعلم (اللہ بہتر جانتا ہے) کہتے ہیں۔

علامہ طحاویؒ کا کلام، اس سے قبل بھی گزر چکا ہے، یعنی ”أنه ماسلم في دينه إلّا من سلم للّٰه عزوجل ولرسوله ﷺ، ورَدّ علم ما اشتبه عليه إلٰى عالمه.

وقد أمر اللّٰه نبيَّه ﷺ أن يردّ علمَ مالايعلم إليه، فقال تعالٰى ﴿قل اللّٰهُ أعلم بمالبِثوا له غيب السمٰوٰت والارض﴾ (الكهف:٢٦)
﴿قل ربی أعلم بعدّتهم﴾ (الكهف:٢٢)

وقد قال صلى اللّٰه عليه وسلم: لما سُئل عن أطفال المشركين: ”اللّٰه أعلم بما كانوا عاملين“ (أخرجه البخاري ۱۳۸۴، ومسلم ۲۶۵۹)

بہر حال جن چیزوں کا ہمیں علم نہیں، ان کے بارے میں ہم کہہ دیں گے: ”اللّٰه أعلم“ یہی علماء محققین کا طریقہ ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: ”إن من أفتى الناس في كلّ مايسألونه عنه لمجنون.“ جو شخص پوچھنے والے کے ہر سوال کا جواب بے سمجھے دینے لگے وہ پاگل ہے۔ (اعلام الموقعين: ج ۱)

ونَرى المسحَ على الخفّين في السَّفر والحَضر كما جاء في الأثر.
سفر حضر میں ہم موزوں پر مسح جائز سمجھتے ہیں، جیسے کہ آثار میں منقول ہے۔

”مسح على الخفين“ کے جواز پر اجماع ہے، کیونکہ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ سے تواتر کے ساتھ احادیث منقول ہیں۔ والرافضة تخالف هذه السنة المتواتره. روافض ”مسح علی الخفین“ کی بجائے مسح رِجلین کے قائل ہیں۔ حضرت حسن بصریؒ کا قول مروی ہے. قال: حدّثني ”سبعون رجلاً من أصحاب النبي ﷺ أنه مسح على الخفين“ (معارف السنن ج ۱، ص ۳۳۱)

وقال الكرخيؒ: أخاف الكفر على من لم يرى المسح على الخفين لأنّ الآثار جاءت فيه، في حيِّز التواتر. وعن أبي حنيفةؒ: ماقلت

حتى جاء نبي فيه مثلُ ضوءِ النهار، وروى عن أبي حنيفةؒ أنه سُئل عن مذهب أهل السنة والجماعة فقال: هو أن تُفضِّلَ الشيخين(ابوبکر وعمر) وأن تحب الخَتنين(عثمان وعلي) وأن ترى المسح على الخفين. (شرح المنية) دراصل مسئلہ ''مسح علی الخفین'' کاتعلق تو علم فقہ سے ہے،لیکن چونکہ روافض نے اس کا انکار کیا ہے،اس لئے ان کے مقابلے میں اس مسئلے کا اقرار اہل السنة والجماعة کی خاص علامت بن کر کتب عقائد میں مذکور ہوا۔درمختار میں ہے کہ مسح علی الخفین کا ثبوت سنت مشہورہ سے ہےاورراوی حدیثِ مسح علی الخفین کے ۸۰رصحابہ ﷺ سے زیادہ ہیں اوران میں عشرہ مبشرہ بھی ہیں۔ (الدرالمختار:باب المسح علی الخفین)

> والحج والجهاد ماضيان، مع أولي الأمر من المسلمين، برِّهم وفاجرهم إلى قيام الساعة، لايُبطلهما شيء ولاينقضهما.
>
> مسلمانوں میں سے نیک وبدحکمرانوں کے (یعنی انکی معیت میں) ساتھ حج اور جہاد، قیامت تک جاری رہیں گےان کوکوئی چیز نہ توختم کرسکتی ہے اورنہ توڑسکتی ہے۔

يشير الشيخ إلى الرد على الرافضة، حيث قالوا: لاجهاد في سبيل الله حتى يخرج الرضاء من آل محمد ﷺ، وينادي منادٍ من السماء: اتبعوه. مع أولي الأمر :أي مع الصّحة مع أولي الأمر. برِّهم: عادلهم فاجرهم :ظالمهم، لأن برَّ الامام ليس بشرط، لصحتهما، ولأن الحج والجهاد فرضان يتعلقان بالسفر، فلابد من سائس يسوس الناس فيهما ويقاوم العدو، وهذا المعنى كما يحصل بالإمام البر يحصل بالإمام الفاجر.

وقد كان السّلف من الصحابة والتابعين يحُجّون ويجاهدون مع كل إمام،برّأوفاجر من غير نكير فكان ذلك إجماعًا.

غرضیکہ حج اور جہاددونوں میں انتظام کی ضرورت ہےاورانتظام جیسے امام عادل کی طرف سے ہوسکتا ہے،فاسق وفاجربھی اس کانظم ونسق کرسکتا ہے۔

کراماً کاتبین

ونؤمن بالکرام الکاتبین، فإن اللّٰہ قد جعلھم علینا حافظین.
ہم ”کرام کاتبین“ پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ بے شک انکو اللہ تعالیٰ نے ہمارا محافظ بنایا ہے۔

دراصل فرشتے دو قسم کے ہیں (۱) دو فرشتے اللہ کے حکم سے ہر وقت انسان کی تاک میں لگے رہتے ہیں، جو لفظ اس کے منہ سے نکلے وہ لکھ لیتے ہیں، نیکی داہنے والا اور بدی بائیں والا۔ چنانچہ (سورہ ق آیت:۱۷) ﴿**إذ یتلقّی المتلقِّین عَنِ الیَمِیْنِ وعن الشِّمالِ قعِید**﴾ میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ (۲) دوسری قسم وہ فرشتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے موافق ان بلاؤں کے دفع کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں، جن سے حق تعالیٰ بندہ کو بچانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ (سورۃ رعد آیت:۱۱) میں ارشاد ہے۔ ﴿**لہ معقِّبٰتٌ مِّنْ بین یدیہ ومن خلفہ یحفظونہ من أمر اللّٰہ**﴾۔

ہر شخص کی حفاظت کے لئے کچھ فرشتے مقرر ہیں، جن کی بدلی ہوتی رہتی ہے، کچھ اس کے آگے اور کچھ اس کے پیچھے کہ وہ بحکم خدا بہت بلاؤں سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

وفي الصحیح البخاري عن النبي ﷺ أنہ قال: ”یتعاقبون فیکم ملائکۃٌ باللیل وملائکۃٌ بالنّھار، ویجتمعون في صلاۃِ الصبح وصلاۃ العصر، فیصعد إلیہ الّذین کانوا فیکم، فیسألھم. وھو أعلم بھم، کیف ترکتم عبادی؟ فیقولون: أتیناھم وھم یُصلّون، وفارقناھم وھم یُصلُّون ۔ترمذی کی روایت میں ہے: **إن معکم من لایفارقکم إلاعند الخلاء وعند الجماع فاستحیوھم وأکرموھم.“**

الحاصل یہ محافظ فرشتے دین ودنیا دونوں کی مصیبتوں اور آفتوں سے انسان کی سوتے جاگتے حفاظت کرتے رہتے ہیں۔

ثم قد ثبت بالنصوص أن الملائکۃ تکتُب القول والفعل، وکذالک النّیۃ، لأنھا فعل القلب، فدخلت في عموم ”یعلمون ماتفعلون“.

ملک الموت

ونؤمنُ بمَلِکِ الموتِ المُوَکَّلِ بِقَبْضِ أرواحِ العالمین.
ہم ملک الموت پر بھی ایمان رکھتے ہیں، جسے اللہ تعالیٰ نے روحیں قبض کرنے کی ذمہ داری سونپی ہے۔

"**ملک الموت**" سے مراد، عزرائیل علیہ السلام ہے، لیکن ﴿**الذین تتوفھم الملائکۃ**﴾ اور ﴿**حتی إذاجاء أحدکم الموت توفّتہ رسلنا**﴾ میں "**ملائکۃ**" اور "**رُسُل**" بلفظ جمع لایا گیا ہے، اس میں اشارہ ہے کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام تنہا یہ کام انجام نہیں دیتے، بلکہ اعوان اور مددگار کی حیثیت سے ان کے ماتحت بہت سے فرشتے اس میں شریک ہوتے ہیں۔ ﴿**قل یتوفّٰکم ملک الموت الّذی وکّل بکم**﴾ میں اگرچہ ملک الموت واحد کا صیغہ ہے، لیکن درحقیقت یہ واحد کا صیغہ نہیں، بلکہ اسم جنس ہے جو قلیل اور کثیر دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یا پھر یہ واحد ہی کا صیغہ ہے، مگر قبض ارواح کی نسبت صرف ملک الموت (عزرائیل) کی طرف اس لئے ہے کہ وہی ذمہ دار اور امیر ہے اس طرح آیات میں تعارض نہیں رہے گا۔

امام تفسیر، مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: ساری دنیا ملک الموت کے سامنے ایسی ہے جیسے کہ انسان کے سامنے ایک کھلے طشت میں دانے پڑے ہوں وہ جس کو چاہئے اٹھالے، یہ مضمون ایک مرفوع حدیث میں بھی آیا ہے، "**ذکرہ القرطبی فی التذکرہ**" (بحوالہ معارف القرآن: ۷/۶۷)

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے کے ذریعے قبض روح انسان کے لئے مخصوص ہے اس کی شرافت وکرامت کے لئے، باقی جانور باذن خداوندی بغیر واسطہ فرشتے کے مرجائیں گے۔

فائدہ: ملک الموت، کسی کی موت کا وقت پہلے سے نہیں جانتا جب تک کہ اس کو حکم نہ دیا جائے کہ فلاں کی روح قبض کرلو۔ (أخرجہ احمد وابن أبی الدنیا عن معمر، مظہری)

عذاب قبر

وبعذاب القبر لمن كان له أهلاً.
اور جو شخص قبر کے عذاب کا مستحق ہو اس کے لئے عذاب فی القبر پر ہم یقین رکھتے ہیں۔

وبعذاب القبر: أي نؤمن بعذاب القبر - ماقبل "بملک الموت" پر عطف ہے۔ "لمن كان له أهلاً" قبر کے عذاب ک کے مستحق اور اہل، تمام کفار ہیں اور بعض گناہ گار اہل ایمان بھی مستحق ہیں، مگر بعض دیگر گناہ گار مؤمنین کو قبر میں عذاب نہیں ہوگا۔ مثلاً شہید کے بارے میں روایت ہے: "ويُجار من عذاب القبر" شہید کو عذاب سے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ (ترمذی)۔ جہاد کے سلسلے میں پہرہ داری کرنے والے کے بارے میں روایت ہے۔ "ومن مات فيه وُقي فتنة القبر" جو پہرہ داری کے دوران مر جائے، اسے فتنہ قبر سے نجات دے دی جائیگی، ترمذی کی ایک اور روایت ہے "من قتله بطنُه لم يُعذّب في قبره" جو پیٹ کی بیماری سے مر گیا، اسے عذاب قبر نہیں ہوگا۔ ہر رات سورۃ ملک پڑھنے والا عذاب قبر سے محفوظ ہوگا (نسائی)۔ ماہِ رمضان میں مسلمان عاصی وفات پا جائے تو اس کو قیامت تک عذاب قبر سے امن ہو جاتا ہے ایسے ہی جو مسلمان عاصی جمعہ کے دن یا جمعہ کی رات مر جائے اس کا عذاب قبر معاف ہے۔ (شامی، آخر الجنائز)

عذاب قبر کے سلسلے میں چار امور قابل ذکر ہیں۔

(۱) جمہور اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک عذاب و تنعیم کا تعلق جسد مع الروح سے ہے، روح چاہے ساتویں آسمان کے اوپر ہو یا سجین میں ہو، مگر اس کا تعلق بدن عنصری کے ساتھ اس طرح ہوگا جس طرح آسمان سے سورج کی شعاع زمین پر پڑتی ہو، روح کے ادنی تعلق سے مردہ کے جسم میں "نوعٌ من الحياة" پیدا ہو جاتی ہے، جس سے عذاب و ثواب کا ادراک کر سکے، لیکن روح کا یہ تعلق تدبیر و تصرف کا نہیں ہے، وہ تو دنیا میں تھا، اور ختم ہو گیا، ایسا تعلق دوبارہ صرف آخرت میں ہوگا، عالم برزخ میں روح کا تعلق ایسا نہیں ہوگا جیسے دنیا

میں تھا، بلکہ اس تعلق سے ایک خاص قسم کی حیات اتنی مقدار میں آجائے گی جس سے عذاب وثواب کا ادراک کر سکے۔ **فإن عود الروح إلى الجسد ليس على الوجه المعهود في الدنيا، بل تعاد الروح إليه إعادة غير إعادة المألوفة في الدنيا.**

(شرح عقيدة الطحاوية: ص/۴۰۰)

(۲) مردہ کا جسم جب حُفرۃ (گڑھے) میں رکھا جاتا ہے، تب تو اشکال نہیں، کیونکہ عذاب وثواب کا معاملہ اسی جگہ ہوگا، جہاں جسم رکھا گیا ہے، یعنی مدفن ارضی میں اور یہی عام ہے، لیکن بعض دفعہ کچھ شاذ ونادر صورتیں بھی پیش آتی ہیں، جیسے دریا میں غرق شدہ شخص اور وہ شخص جس کو درندے کھا گئے ہوں اور جس کو ہوا میں پھانسی چڑھا دیا گیا ہو اور جس کے جسم کو جلا کر راکھ کر دیا گیا ہو، اور کبھی جسم کے اجزاء خاک میں مل جاتے ہیں پھر بھی ان سب کو عذاب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے کہ جسم کے کل یا بعض اجزاء منتشرہ سے روح کا تعلق قائم کر کے ان میں نوعٌ من الحیات پیدا کر کے درد، لذت، دکھ اور سکھ کا شعور ان اجزاء میں پیدا کر دے یہ بات قادر مطلق پر نہ مشکل ہے اور نہ ممتنع ہے۔ غرضیکہ بندہ کو دنیا کے بعد اور آخرت سے پہلے درمیانی وقفے یعنی عالم برزخ سے واسطہ پڑے گا خواہ وہ قبر میں ہو یا کسی اور جگہ ہو۔

(۳) رہی یہ بات کہ ہمیں تو میت کے جسم پر کوئی معاملہ (عذاب وتنعیم کا) ہوتا نظر نہیں آتا، تو محض یہ شبہ انکار عذاب قبر وتنعیم قبر کا باعث نہیں بن سکتا، کیونکہ کسی شی کی عدم رؤیت، عدمِ وجود کی دلیل نہیں ہوتی، جنات، فرشتے اور ہوا بھی کسی کو نظر نہیں آتی، مگر ایک حقیقت ہے خواب دیکھنے والا خواب میں کسی مصیبت میں گرفتار ہو کر سخت عذاب میں بے چین ہوتا ہے، مگر پاس بیٹھنے والوں کو اس کی کچھ خبر نہیں ہوتی، اسی طرح عذاب قبر کے إخفاء عن الناس میں بھی حکمتیں ہیں، ایک عالم (عالم برزخ وقبر) کو دوسرے عالم (عالم دنیا) پر قیاس کرنا غلط ہے لہٰذا عالم برزخ وقبر کے علم کا ذریعہ صرف اور صرف وحی الٰہی ہے۔

(۴) خوارج، بعض مرجئہ اور بعض معتزلہ کے علاوہ موجودہ زمانہ کے آزاد خیال اور منکرین حدیث نے بھی عذاب قبر کا بالکلیہ انکار کیا ہے، اس سلسلے میں وہ کچھ شبہات

پیش کرتے ہیں، ماقبل کی تفصیل سے وہ شبہات خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔

محمد بن جریر کرامی اور عبداللہ بن کرام اور ابوالحسن صالحی وغیرہ کے نزدیک عذاب صرف جسم بے جان پر ہوتا ہے، لیکن جب جسم میں کسی قسم کی بھی حیات نہ ہو، اس پر عذاب ماننے کا کیا معنی ہے؟

ابن حزم ظاہری اور ابن نیسرہ صرف اور صرف روح پر عذاب وثواب مانتے ہیں، لیکن جمہور اہل سنت کے مذہب کی تفصیل گزر چکی ہے۔

> **وسُؤال مُنكَرٍ و نَكِيْرٍ فِيْ قَبْرِهِ عَنْ رَبِّه ودِيْنِهِ ونَبِيِّهِ.**
> ہم قبر میں منکر ونکیر کے سوالات کو بھی یقین کے ساتھ مانتے ہیں جو سوالات وہ اللہ کی ذات، دین اور نبی اکرم ﷺ کے بارے میں پوچھیں گے۔

یہاں تین باتیں ہیں (۱) منکر: **بفتح الكاف، كما في القاموس، اسم مفعول من أنكره إذا لم يعرفه. نكير: فعيل بمعنى مفعول من نكر بالكسر كلاهما ضد المعروف، سميّا بذٰلک لأن الميت لم يعرفهما ولم يرصورة مثل صورتهما. (طيبي، شرح مشكوٰة) كأنّ النكير أيهب من المنكر حيث سمى بالمصدر (عصام)**، یعنی "نکیر" "منکر" کے مقابلہ میں زیادہ دہشت والا ہے۔ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ منکر نکیر گناہ گاروں کے لئے ہیں۔ اور مبشر بشیر فرمان برداروں کے لئے ہیں۔
(فتح الباری: ۳/۴۸۰)

بہر حال منکر اور نکیر، دو فرشتے ہیں کہ قبر میں ہر بندہ سے آکر رب، دین اور نبی کے بارے میں سوال کریں گے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "**إذا اُقْبِر الميتُ أتاه ملكان أسودان أزرقان يقال لأحدهما المنكر والأخر النكير**" **أزرقان: بتقديم الزاء المعجمعة على الراء المهملة.** اس کا واحد الأزرق ہے، نیلگوں آسمانی رنگ، نیلی آنکھ۔ منکر ونکیر کی اس مخصوص شکل کی بناء پر کفار اور منافقین پر دہشت اور رعب پڑے گا، مگر اہل ایمان کو اللہ حوصلہ اور استقامت نصیب فرمائیں گے۔ (مرقاة شرح مشكوٰة)

(۲) بعض نے کہا ہے کہ: ہوسکتا ہے سوال کرنے والے فرشتے بہت سے ہوں جن میں بعض کا نام منکر اور بعض کا نام نکیر ہو، سوال کے لئے ہر میت کے پاس ان میں سے دو فرشتوں کی تشکیل کی جاتی ہو، جس طرح ہر شخص کے کاتب اعمال فرشتے ہیں۔

(۳) راجح یہ ہے کہ نابالغ مسلم بچے چونکہ غیر مکلف ہیں، اس لئے ان سے نہ تو سوال ہوگا اور نہ ہی ان پر عذاب قبر ہوگا ایسے ہی انبیاء علیہم السلام سے سوال نہ ہوگا، کیونکہ جب امت کے بعض صلحاء سے از روئے حدیث سوال نہ ہوگا تو نبی سے بدرجہ اولیٰ نہ ہوگا۔ کفار کے بچوں کے بارے میں علماء کرام نے توقف کیا ہے۔

(۴) **قال العلماء: فإن ظهر عن الميّت أثر الاسلام سأل عنه المنكر وإن ظهر عنه الكفر سأل عنه النكير.**

علي ماجاء ت به الأخبار عن رسول الله ﷺ وعن الصحابة رضوان الله عليهم. جس طرح کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام ؓ سے اس کے بارے میں احادیث آئی ہیں۔

مرنے اور دفن ہونے کے بعد فرشتوں کے سوالات کا جواب دینا پھر اس امتحان میں کامیابی اور ناکامی پر ثواب یا عذاب کا ہونا قرآن مجید کی تقریباً دس آیات میں اشارۃً اور رسول کریم ﷺ کی ستر احادیث متواترہ میں بڑی صراحت و وضاحت کے ساتھ مذکور ہے۔ (ابن کثیر وشرح الصدور) یہی وجہ ہے کہ بہت سے فقہاء اور متکلمین نے منکرین عذاب قبر کی تکفیر کی ہے، حالانکہ فقہاء کسی کی تکفیر میں بہت احتیاط کرتے ہیں۔

نوٹ: واضح رہے کہ عذاب قبر کی کیفیت کو متعین کرنا دشوار ہے، یعنی قطعی طور پر اس کی کوئی صورت متعین کرنا کہ جس کے انکار کرنے والے کو کافر کہہ دیا جائے، ناممکن ہے یہی کہا جاسکتا ہے کہ عذاب قبر تو یقینی ہے اور اس پر ایمان لانا فرض ہے، لیکن اس کی حقیقت اور کیفیت کا علم اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ (ترجمہ: إکفار الملحدین، مقدمہ: ٦٥)

فائدہ: عذاب قبر کے بارے میں احادیث تواتر لفظی کے قبیل سے نہیں، بلکہ یہ احادیث معنی کے اعتبار سے متواتر ہیں، اگر چہ ان کی جزئیات اور احاد درجہ تواتر تک نہیں پہنچیں، مگر یہ سب احاد امر مشترک (عذاب قبر) پر متفق ہیں۔ یہ تواتر معنوی کہلاتا ہے، تواتر معنوی بھی تواتر لفظی کی طرح قطعی حجت ہے، جو عقیدہ کے اثبات کے لئے کافی ہے۔

> **والقبرُ روضة من رِياض الجنّة أو حُفرةٌ من حُفَر النِّيران.**
>
> قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔

یہ دراصل ترمذی کی حدیث ہے، جس کو طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اقتباساً لیا ہے، اس حدیث میں عذاب قبر کے ساتھ ساتھ خاص کر تنعیم قبر کا بھی ذکر ہے۔

نيران: بالكسر جمع نار وأورده بلفظ الجمع بخلاف الجنة تهويلا.
یعنی جمع کا صیغہ جہنم کی ہولناکی کی خاطر استعمال ہوا ہے۔

> **ونُؤْمِنُ بالْبَعْثِ وجَزاءِ الأعمالِ يَوْمَ القيامَةِ والْعَرْضِ والحسابِ وَقِراءةِ الكتاب والثواب والعقاب والصراط والميزان.**
>
> ہم موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے، قیامت کے روز اعمال کی جزاء پیشی، حساب و کتاب، اعمال نامے کی قراءت، ثواب و عقاب، پل صراط اور میزان جیسے حقائق پر ایمان رکھتے ہیں۔

بعث کی تعریف

تعریف سے قبل بطور مقدمہ کے یہ سمجھئے کہ اجزاء انسانی کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) اجزاء اصلیہ: کھانا کھانے سے پہلے انسان میں موجود اجزاء، جو ابتداء عمر سے لیکر آخر تک باقی رہتے ہیں۔ (۲) اجزاء فضلیہ: وہ زائد اجزاء جو کھانا کھانے کے بعد غذا سے حاصل

ہوں۔اب بعث کی تعریف یہ ہے کہ ''البعث: ان یبعث اللّٰہ تعالیٰ الموتیٰ من القبور.'' یعنی جزاء وسزا کے لئے اللہ تعالیٰ کا،مردوں کو دوبارہ زندہ کرنا بعث کہلاتا ہے ،جس کی کیفیت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ ہر جسم کے اجزاء اصلیہ کو جمع فرما کر دنیا میں جو روح اس جسم سے متعلق تھی،وہ روح اس جسم کی طرف لوٹا دیں گے،اس موقع پر روح کا رشتہ اور تعلق بدن سے حد درجہ مضبوط ہوگا،کیونکہ اس کے بعد بدن کو فساد،موت اور نیند کبھی نہیں آسکتی۔

عاص بن وائل یا اُبی ابن خلف کافر جب اپنے ہاتھ میں بوسیدہ ہڈیاں لیکر آیا اور حضور ﷺ کے سامنے کہنے لگا:﴿من يُحيي العظام وهي رميم﴾ بھلا ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندگی دے گا۔(خازن) تو اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی:۔﴿قل يُحييها الّذي أنشأها أول مرة﴾ اے نبی پاک بتلا دیجئے کہ:ان بوسیدہ ہڈیوں کو وہ اللہ زندہ کرے گا،جس نے انہیں پہلی بار پیدا کیا یہ اور اس طرح کی بے شمار آیات اور احادیث ہیں جو صاف اور صریح لفظوں میں بعث بعد الموت کی خبر دیتی ہے۔

وجزاءِ الأعمال يوم القيامة: قیامت کے روز اعمال کی جزاء پر ہم ایمان رکھتے ہیں۔جیسے ارشاد ہے ﴿اليوم تجزى كلُّ نفس بما كسبت لاظُلم اليوم إن الله سريع الحساب﴾[مؤمن:۱۷]

آج ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ دیا جائے گا،آج کسی پر ظلم نہ ہوگا۔اللہ بہت جلد حساب لینے والے ہیں۔یا جیسے سورۃ السجدہ میں ہے ﴿جزاء ابما كانوا يعملون﴾[السجدۃ:۱۷]

والعرض: پیشی پر بھی ہم ایمان رکھتے ہیں۔**والحساب:** حساب وکتاب پر ہم یقین رکھتے ہیں۔الغرض حساب بھی ہوگا اور کسی پر فقط عرض ہوگا۔عرض کا مطلب **حساب یسیر** ہے،چنانچہ بخاری کی ایک حدیث میں،حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''من حوسب يوم القيامة عذب'' یعنی قیامت کے روز جس سے حساب لیا جائے وہ عذاب سے نہ بچے گا،اس پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا کہ:کیا قرآن میں حق تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں ہے:﴿يحاسب حسابًا يسيرًا﴾ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اس

آیت میں جس کو "حساب یسیر" فرمایا وہ درحقیقت مکمل حساب نہیں، بلکہ صرف رب العزت کے سامنے "عرض" پیشی ہے اور جس شخص سے اس کے اعمال کا پورا پورا حساب لیا گیا وہ ہرگز عذاب سے نہ بچے گا۔ معلوم ہوا کہ مؤمنین کے اعمال بھی رب العزت کے سامنے پیش تو سب ہوں گے، مگر ان کے ایمان کی برکت سے ان کے ہر عمل پر مناقشہ نہیں ہوگا، اسی کا نام "حساب یسیر" ہے۔

وقراءة الکتاب: اعمال نامے کے پڑھنے پر ہم ایمان رکھتے ہیں، اعمال نامہ وہ لکھی ہوئی کتاب ہے، جس میں بندوں کی طاعات اوران کے معاصی درج ہوں گے، اہل ایمان کا اعمال نامہ سامنے سے داہنے ہاتھ میں اور کفار کا پیچھے سے بائیں ہاتھ میں دیا جائیگا، جس کو وہ پڑھیں گے، جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ونخرج له یوم القیامة کتابًا منشورا إقرأ کتابک کفیٰ بنفسک الیوم حسیبا﴾ [بنی اسرائیل: ۱۴] یعنی قیامت کے دن اس انسان کا اعمال نامہ اس کے دیکھنے کے لئے نکال کر سامنے کردیں گے جس کو وہ کھلا ہوا دیکھ لے گا اور اس سے کہا جائیگا کہ لے اپنا اعمال نامہ خود پڑھ لے آج تو خود ہی اپنا حساب جانچنے کے لئے کافی ہے، اصحاب یمین بڑے سرور وانبساط سے اپنا اعمال نامہ پڑھیں گے، اور دوسروں کو کہیں گے ﴿هاؤم اقرء وٗ کتابیه﴾ [الحاقہ: ۱۹] کہ آؤ میری کتاب پڑھ لو، باقی اصحاب شمال کو جب پیٹھ کے پیچھے سے بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ پکڑا جائے گا۔ ﴿فسوف یدعوا ثبورًا﴾ [انشقاق: ۱۱] عذاب کے ڈر سے پکارے گا موت۔ موت۔

والثواب والعقاب: ثواب اور عقاب پر ایمان رکھتے ہیں، الثواب والمَثُوبة: اعمال کا بدلہ، خیر ہو یا شر، عمومًا خیر کے لئے مستعمل ہے۔ عَاقَبَهُ وعِقَابًا، مُعاقَبَةً بذنبه وعلیٰ ذنبه " مواخذہ کرنا، سزا دینا اسم "العقوبة"۔ اعمال خیر پر ثواب اور اعمال بد پر عقاب کے سلسلے میں قرآن وحدیث کی بہت سی آیات واحادیث وارد ہیں۔ **والصراط**: پل صراط پر بھی ہم ایمان رکھتے ہیں، جہنم کی پشت پر یہ ایک پل

ہوگا جس کے اوپر سے سب کو گزرنا ہوگا۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وإن منکم إلا واردھا﴾ [مریم:۷۱] صحیح اور راجح قول کے مطابق "ورود" سے مراد "مرور علی الصراط" ہے۔

قال ابوسعید الخدری الصحابی ﷺ: "بلغني أن الجسر أدق من الشعر وأحدُّ من السیف" (رواہ مسلم وھذا فی حکم المرفوع) یعنی یہ پل بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے، احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ایمان میں سے بعض پل صراط پلک جھپکنے میں عبور کریں لیں گے اور بعض اہل ایمان اچکنے والی بجلی کے مانند اس پر گزر جائیں گے، بعض تیز ہوا کے مانند اس پر گزر جائیں گے، بعض تیز رفتار گھوڑے کی طرح گزریں گے اور بعض پرندوں کی رفتار سے عبور کریں گے۔ الغرض اہل ایمان حسب درجات اس کو عبور کر کے آگے جنت میں پہنچ جائیں گے اور جہنمی لوگ کٹ کر نیچے گر جائیں گے۔

والمیزان: أي نؤمن بالمیزان. میزان سے مراد وہ شیء ہے جس کے ذریعے اعمال تولے جائیں گے، جمہور کا مسلک یہ ہے کہ میزان ایک ہی ہے "نضع الموازین" میں اس کو بصیغہ جمع اس لئے تعبیر کر دیا ہے کہ وہ بہت سے موازین کا کام دے گی، قیامت تک سب کے اعمال کو یہی ترازو تولے گی، جمہور کے قول کے مطابق وزن اعمال کی صورت یہ ہوگی کہ عین اعمال کو وہاں جواہر مستقلہ (جسم) کی شکل دے دی جائے گی اور ان کا وزن کیا جائے گا یا اعمال اعراض ہونے کے باوجود تولے جائیں گے، کیونکہ بُخار، موسم، گاڑی کی رفتار، بجلی، گیس اور زلزلہ وغیرہ اگر تولے اور ماپے جا سکتے ہیں تو اعمال کیونکر نہیں تولے جا سکتے؟۔

والجنة والنار مخلوقتان

جنت اور دوزخ اللہ کی مخلوق ہیں۔

جنت اور جہنم دونوں برحق ہیں دونوں کے ثبوت پر بے شمار آیات واحادیث ہیں، معتزلہ کا خیال تو یہ ہے کہ جنت اور جہنم ابھی موجود نہیں ہیں، بلکہ قیامت کے دن پیدا کی جائیں گے معتزلہ چونکہ عقل کے پجاری ہیں اس لئے وہ کہتے ہیں کہ جزاء سے پہلے جنت وجہنم کی تخلیق بلاوجہ ہے، کیونکہ اس طرح تو جنت اور جہنم ایک طویل عرصہ کے لئے معطل ہوں گی۔ لیکن اہل سنت کے نزدیک جنت اور جہنم پیدا کی جاچکی ہیں اور اس وقت بھی موجود ہیں، اس لئے کہ (۱) آدم اور حواء علیہما السلام کا قصہ قرآن میں موجود ہے اور دونوں کو جس جنت میں رہائش دی گئی تھی اس سے مراد یہی معروف جنت ہے۔ (۲) نصوص قرآنیہ میں جنت اور جہنم کے تیار کیئے جانے کے بصیغہ ماضی خبر دی گئی ہے۔ جیسے ﴿أُعِدّت للمتقين﴾ [آل عمران:۱۳۳]

﴿أُعِدّت للّذين امنوا باللّٰه ورسله﴾[الحدید:۲۱]

﴿أعدت للكافرين﴾[آل عمران:۱۳۱]

لاتفنيان أبدًا ولا تبيدان.
جنت اور دوزخ کبھی فنا نہیں ہوں گی نہ ہی ان پر ہلاکت آئیگی۔

(مقالات کوثری:۲۷۶) پر "**مسالة الخلود**" کے عنوان کے تحت علامہ کوثریؒ لکھتے ہیں: "**دوامُ نعيم أهل الجنة" واستمرار عذاب أهل الجحيم ممّا عُلم من الدين بالضرورة وقد تواردت الأدلة على بقاء الجنة والنار، ومضت الأمة على هذه العقيدة مدى الدهور**" الغرض قرآن کریم کی متعدد آیات سے جنت کا ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنا ثابت ہے۔ لیکن جہم بن صفوان جنت اور جہنم کے فناء کے قائل ہے، مگر صحابہ ﷺ اور تابعینؒ میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں، حدیث شریف میں ہے کہ جنت اور جہنم کی بیچ میں موت ذبح کردی جائے گی اور کہا جائے گا۔"**یا أهل الجنة خلودٌ فلاموت، و يا أهل النار خلودٌ فلا موت**"

فإن اللّٰه تعالیٰ خلق الجنة و النار قبل الخلق و خلق لهما أهلاً .
اللہ تعالیٰ نے جنت اور دوزخ کو دوسری مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے بنایا اور ان کے لئے اہلیت رکھنے والے لوگ بنائے۔

دلیل اس دعویٰ کی یہ ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ولقد ذرأنا لجهنم كثيرًا من الجن والإنس﴾ [اعراف:۱۷۹] اور ہم نے ایسے بہت سے جن اور انسان دوزخ ہی میں رہنے کے لئے پیدا کئے ہیں۔ مسلم اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ "إن الله خلق للجنة أهلاً، خلقهم وهم في أصلاب آبائهم وخلق للنار أهلاً، خلقهم لها وهم في أصلاب آبائهم" اللہ تعالیٰ نے جنت اور جہنم کے لئے اہل پیدا کیئے درآں حالیکہ وہ ابھی باپ کی پیٹھ میں تھے۔

فمن شاء منهم إلى الجنة أدخله فضلاً منه ومن شاء منهم إلى النّار أدخله عدلا منه.
ان میں سے جسے چاہے گا اپنے فضل وکرم سے جنت میں داخل کرے گا اور جسے چاہے گا اپنے عدل وانصاف کے ساتھ جہنم رسید کرے گا۔

اس کا حاصل یہ نکلا "كل عطاء منه فضل و كل عقوبة منه عدل" یعنی اللہ کے ہاں ظلم نہیں اگر عطاء کرے تو یہ اس کا فضل ہے اور اگر عذاب میں مبتلا کرے تو یہ اس کا عدل ہے۔

و كلٌّ يَعمل لما قد فُرِغ له و صائرٌ لما خُلق له والخير والشرُّ مقدَّرانِ على العباد.
ہر انسان وہی کام سرانجام دیتا ہے جس کے لئے اسے فراغت دی گئی اور ہر شخص اسی طرف لوٹنے والا ہے، جس کے لئے اسے پیدا کیا گیا۔ خیر وشر کا بندوں کے لئے فیصلہ کردیا گیا ہے۔

ایک نسخے میں ''كل يعمل لما قد فرغ منه'' کے الفاظ ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ہر شخص عمل کر رہا ہے اس چیز کے لئے جس سے فراغت ہو چکی ہے۔ حاصل یہ کہ جس کے لئے جو مقدر ہے وہ ہو کر رہے گا۔

والاستطاعة التي بها الفعل، من نحو التوفيق الّذي لايوصف المخلوق به تكون مع الفعل - وأمّا الاستطاعة مِنْ جهةِ الصّحةِ، والوسع، والتمكين، وَسَلامةِ الألاتِ، فَهِيَ قَبْلَ الفِعْلِ، وَبِهَا يتعلّقُ الخطاب وهو كما قال تعالىٰ: ﴿لايُكلّفَ اللّٰه نفسًا إلا وُسْعَهَا﴾ [البقرة: ۲۸٦]

اور وہ استطاعت جس کی وجہ سے فعل واجب ہوتا ہے جیسے توفیق ہے، جس سے مخلوق کا اتصاف جائز نہیں، تو یہ استطاعت، فعل کے ساتھ ہوتی ہے، اور رہی وہ استطاعت جو صحت، وسعت، قدرت اور آلات کی سلامتی کے اعتبار سے ہے۔ اس کا وجود فعل سے پہلے ہوتا ہے اور خطاب (حکم) اسی استطاعت سے متعلق ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

استطاعت دو طرح کی ہوتی ہے: ایک قدرت حقیقی، جو استطاعت کا حقیقی معنی ہے۔ دوم اسباب وآلات کا سالم ہونا اور اعضاء کا صحیح ہونا، جو استطاعت کا مجازی معنی ہے۔ **(۱) قدرت حقیقیہ:** قدرت حقیقیہ سے مراد، اللہ تعالیٰ کی توفیق ہے یہ قدرت حقیقیہ فعل کا مقارن بالزمان ہے، پہلے سے بندہ کے اندر فعل کی قدرت نہیں ہوتی، بلکہ جب وہ فعل کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس فعل کی قدرت پیدا فرما دیتے ہیں جس کے ساتھ ہی فعل موجود ہو جاتا ہے نیز قدرت حقیقیہ فعل کے لئے علت بھی ہوتی ہے۔ **(۲) استطاعت بمعنی سلامت اسباب وآلات وصحت اعضاء:** یہ فعل سے مقدم ہوتی ہے۔

والحاصل أن القدرة لها إطلاقان فتطلق تارة ويرادبها حقيقية القدرة وهي مع الفعل، وتطلق أخرىٰ ويراد بها الوسع والسلامة وهي قبل الفعل.

انسان کو مکلف کرنے کا مدار قدرت حقیقیہ پر نہیں ہوتا، بلکہ قدرت بمعنی سلامت اسباب پر ہوتا ہے (جس کی طرف آیت کریمہ میں اشارہ ہے) کیونکہ جو قدرت مدار تکلیف ہوتی ہے وہ فعل پر مقدم ہوتی ہے، لہٰذا استطاعت بمعنی سلامت اسباب ہی مدار تکلیف ہوگی۔

افعال العباد

وأفعال العباد هي بخلق الله تعالىٰ وكسب من العباد.

بندوں کے افعال اور کام اللہ کی مخلوق اور بندوں کا کسب وکمائی ہیں۔

خلق اور کسب کا فرق

الخلق فعل الله وهو إحداث الاستطاعة في العبد واستعمال الاستطاعة المحدثة فعل العبد.

یعنی بندہ میں استطاعت اور عمل کی طاقت پیدا کرنا خلق ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے۔ اور استطاعت حادثہ، یعنی اللہ نے بندہ کو عمل کرنے کی جو قوت اور قدرت عطاء کی ہے اس قوت اور قدرت کو استعمال کرنا کسب ہے اور یہ بندہ کا فعل ہے۔

افعال عباد کی دو قسمیں ہیں (۱) **افعال اضطراریہ**: جو بندہ سے اس کے ارادہ واختیار کے بغیر صادر ہوتے ہیں۔ جیسے "العروق النابضة" (دھڑکتی رگیں) درختوں کی حرکت اور حرکت مرتعش (اس شخص کی حرکت جیسے رعشہ کا عارضہ ہو) اس طرح کی افعال بالاتفاق اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ (۲) **افعال اختیاریہ**: مثلاً کفر وایمان، طاعت اور معصیت وغیرہ، یہی محل اختلاف ہیں، جبریہ ان افعال کے بارے میں بندہ کو مجبور محض مانتے ہیں اور معتزلہ کہتے ہیں کہ بندہ خود ان افعال کا موجد اور خالق ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت کو کوئی دخل نہیں اور اہل سنت والجماعت نہ تو جبریہ کی طرح بندہ کا مجبور محض مانتے ہیں

کہ اس کی قدرت واختیار کا کوئی دخل نہ ہو اور نہ معتزلہ کی طرح اللہ تعالیٰ کو بالکل بے دخل مانتے ہیں، بلکہ کہتے ہیں کہ: بندوں کے افعال اختیاریہ بندہ اور اللہ دونوں کی قدرت سے وجود میں آتے ہیں، بندہ کی قدرت کا تعلق کسب سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کا تعلق خلق سے ہے، یعنی بندہ کاسب ہے اور اللہ خالق ہے، اہل سنت کی دلیل متعدد نصوص ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿واللّٰہ خلقکم وما تعملون﴾ [الصافات:٩٦] اللہ خالق ہے تمہارا اور تمہارے اعمال کا بھی۔ ما مصدریہ ہے، "أي واللّٰه خلقكم وعملكم" دوسری جگہ فرمایا: ﴿لا إله إلا هو خالق كل شيء فاعبدُوه﴾ [الأنعام:١٠٢] جب اللہ تعالیٰ ہر شی کا خالق ہے اور افعال عباد بھی شی ہیں لہٰذا افعال عباد کا بھی خالق وہی ہوگا۔

ولم يكلفهم اللّٰه تعالىٰ إلّا ما يُطيقون.

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو انہیں کاموں کا حکم دیا ہے جن کی وہ طاقت رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بندہ کو "مالا يطاق" (ایسے کام کا کرنا بندہ کی قدرت اور بس میں نہیں) کا مکلّف نہیں بنایا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی طاقت کے بقدر مکلّف بنایا ہے۔ ارشاد ہے: ﴿لايكلف الله نفسًا إلا وسعها﴾ [البقرة:٢٨٦]

اب یہاں دو چیزیں ہیں۔ ایک ہے تکلیف اور دوسری ہے تعجیز، دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ تکلیف میں آمر کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ شخص مامور سے فعل مامور بہ کا وجود ہو اور تعجیز میں آمر کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ شخص مامور سے فعل مامور بہ انجام نہ پاسکے، تاکہ اس کا عاجز ہونا ظاہر ہو جائے، جیسا کہ قیامت کے روز مصوّرین کو اپنی بنائی ہوئی صورتوں کو زندہ کرنے کا امر "أحيُوا ما خلقتم" تعجیز کے لئے ہوگا۔

ولايطيقون إلا ما كلّفهم. وهو تفسير لاحولَ ولا قوةَ إلا باللّٰه نقول: لاحِيلةَ لأحدٍ ولاحركةَ لأحدٍ ولاتحوّل لأحدٍ عن معصيةِ اللّٰه إلا بمعُونةِ اللّٰه ولا قوّة لأحدٍ على إقامة طاعة اللّٰه والثبات عليهما إلا بتوفيق اللّٰه.

اور وہ طاقت نہیں رکھتے ہیں، مگر جس کے وہ مکلّف ہیں "لاحول ولاقوة" کے مفہوم

کا حاصل بھی یہی ہے، ہم یہ اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اس کائنات میں کسی کا کوئی بس نہیں چلتا نہ کوئی چیز اس کے حکم کے بغیر حرکت کرسکتی ہے، اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر نہ کوئی اس کی نافرمانی سے بچ سکتا ہے اور نہ اللہ کی اطاعت کے ادا کرنے پر کسی کو کوئی قوت ہے اور نہ طاعت پر ثابت قدم رہنے کی طاقت ہے، مگر اللہ کی توفیق سے۔

طاقت سے مراد، توفیق خداوندی ہے، اسباب وآلات کا سالم ہونا مراد نہیں ہے، یہاں امام طحاویؒ کی عبارت پر تھوڑا اشکال ہے، کیونکہ ان کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو جن امور (امر ونہی وغیرہ) کا مکلّف بنایا ہے، بندے ان سے زیادہ کی طاقت نہیں رکھتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بندوں کو جن امور کا مکلّف بنا دیا گیا ہے وہ ان سے کہیں بڑھ کر زیادہ مشکل کی بھی طاقت رکھتے ہیں، مگر یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ اپنے بندوں کے ساتھ آسانی اور تخفیف کا ارادہ کرتے ہیں، سختی کا نہیں، اس لئے ان کو زیادہ مشکل کا مکلّف نہیں بنایا، جیسے ارشاد ہے: ﴿یرید اللّٰه بکم الیسر ولایرید بکم العسر﴾[البقرة: ۱۸۵]

"لاحول ولاقوة إلاباللّٰه" سے مصنف کی غرض اثباتِ قدر کی دلیل کو پیش کرنا ہے اور آگے پھر خود اس کی تشریح موجود ہے۔

وَکُلُّ شيءٍ یجري بمشیئة اللّٰه تعالیٰ وعِلمه وقضائه وقدره، غَلبت مشیئتهُ المشیئاتِ کلَّها وغلب قضاؤه الحِیَل کلَّها، یفعل مایشاء وهو غیر ظالم أبدًا"لایُسألُ عمَّا یفعل وهم یُسألون".

کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی منشاء، اس کے علم اور قضاء وقدرت سے جاری ہے اس کی مشیت اور مرضی تمام مشیتوں پر غالب ہے اور اس کا فیصلہ تمام حیلوں اور تدبیروں پر غالب ہے جو وہ چاہتا ہے کرتا ہے وہ ذات کسی پر ظلم نہیں کرتی وہ جو کام کرتا ہے اس سے پوچھا نہ جائے گا (اور جو یہ لوگ کرتے ہیں) ان سے پوچھا جائے گا۔

ارادہ اور مشیت دونوں کا ایک ہی معنیٰ ہے اور ایک ہی صفت سے یہ دونوں

عبارت ہیں۔

قضاء کی دو قسمیں ہیں (١) قضاءِ تکوینی: جیسے ارشاد ہے: ﴿فقضاهن سبع سموات في يومين﴾ [فصلت: ١٢] یعنی دو دن میں اللہ نے آسمان بنائے۔ (٢) قضاء شرعی: جیسے ارشاد ہے: ﴿وقضى ربك أن لاتعبدوا إلا إياه﴾ [الاسراء: ٢٣] یعنی حکم کر چکا تیرا رب کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، یہاں قضاء سے قضاء تکوینی مراد ہے قضاء شرعی مراد نہیں۔

"وهو غير ظالمٍ أبدًا" یعنی اللہ تعالیٰ کبھی بھی کسی پر ظلم نہیں کرتا، قرآن کی بہت ساری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو بندوں کے ظلم سے منزہ فرمایا ہے۔ ارشاد ہے: ﴿ولا يظلم ربك أحدًا﴾ [الكهف: ٤٩] ﴿وما أنا بظلّام للعبيد﴾ [ق: ٢٩] ﴿وما ظلمنا هم ولكن كانوا هم الظالمين﴾ [الزخرف: ٧٦]

حدیث قدسی ہے: "يا عبادي، إني حرَّمتُ الظلم على نفسي وجعلته بينكم محرَّما فلا تظالموا"

ایصال ثواب

و في دُعاء الأحياء وصدقاتهم منفعة للميت.

اور مردوں کے واسطے زندوں کی دعاء میں اور مردوں کی طرف سے زندوں کے صدقہ وخیرات کرنے میں مُردوں کو نفع ہوتا ہے۔

ایصال ثواب کا ثبوت بہت سی احادیث اور آثار سے ہے، شارع نے مردہ کے لئے زندوں کی دعاء اور ان کی طرف سے صدقہ خیرات، تلاوت یا تسبیح وتہلیل یا نفل نماز وغیرہ کے نفع بخش ہونے کی خبر دی ہے، لہٰذا اہل سنت والجماعت اصل ایصال ثواب میں متفق ہیں۔ عبادات بدنیہ میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ، امام احمد اور جمہور سلف وخلف رحمہم اللہ کے نزدیک بدنی عبادات کے ساتھ ساتھ مالی عبادات کا ثواب دوسرے مسلمان کو بخشا

جائز ہے، البتہ ایصال ثواب کے لئے اجتماع کا اہتمام اور اس میں قیود ورسوم جیسے سوئم، جمعرات، چہلم، برسی نیز اہل میت کی طرف سے دعوت کرنا یہ سب امور بدعت اور ناجائز ہیں، ہاں ایصال ثواب قید ورسم کی پابندی سے ہٹ کر جب بھی کرے اور جس چیز کی بھی کرے تو وہ ثواب میت کو پہنچ جاتا ہے یعنی صدقہ، خیرات، دعا اور تلاوت قرآن مجید سب کا ثواب میت کو پہنچ سکتا ہے البتہ ایصال ثواب کے لئے اجرت پر قرآن پڑھوانا درست نہیں۔ (ایصال ثواب بصورت قرآن کے لئے دیکھئے (شرح عقیدۃ الطحاویہ لابن ابی العز اور سورۃ نجم کی آیت کے تحت تفسیر مظہری) جمہور کے برعکس امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ صرف عبادات مالیہ میں وصول ثواب کے قائل ہیں۔ البتہ! معتزلہ وغیرہ مطلقاً ایصال ثواب کے منکر ہیں یہ حضرات قرآن کریم کی آیت: ﴿لیس للإنسان إلا ما سعی﴾ [سورہ نجم:۳۹] سے یوں استدلال کرتے ہیں کہ قرآن تو نفع آخرت کو صرف اپنی ذاتی سعی میں منحصر بتلا رہا ہے۔ جس سے غیر کی سعی کے نافع ہونے کی نفی نکل رہی ہے، اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ آیت میں سعی ایمانی مراد ہے جو آخرت میں غیر کے کار نہیں ہوسکتی کہ ایمان تو کسی کا ہو اور نجات کسی کی ہو جائے باقی احادیث واثار میں سعی عملی مراد ہے جو ایک کی دوسرے کے کام آسکتی ہے، چنانچہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ: ایمان کے بارے میں صرف اپنی کمائی ملے گی یعنی کسی کو دوسرے کا ایمان اس کے کام نہ آئے گا۔ کسی کو ایصال ثواب کرنا بھی تو انسان کی سعی ہے جب اس کا ایصال کردہ ثواب مردہ کو مل جائے تو ایصال کنندہ کو اپنی سعی مل گئی دوسرا جواب یہ ہے کہ صرف اپنے عمل کا فائدہ اللہ کا عدل ہے اور دوسرے کے عمل سے فائدہ اللہ کا فضل ہے۔ ایصال ثواب عقلاً بھی جائز ہے، کیونکہ ثواب دراصل بھلائی کرنے والے کا حق ہے، لیکن جب وہ اس ثواب کو اپنے کسی مسلمان بھائی کے لئے ہبہ کرتا ہے، تو اس سے کوئی مانع نہیں، جیسے زندگی میں اگر کسی مسلمان کو اپنا مال ہبہ کرنا چاہے یا اس کی موت کے بعد اپنے حق کو معاف کر کے میت کو بری الذمہ کرنا چاہے، تو اس کا بھی کوئی مانع نہیں۔

والله تعالىٰ يستجيبُ الدعوات ويقضِي الحاجات.
اللہ تعالیٰ دعاؤں کو قبول اور حاجات کو پورا کرتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أدعوني أستجب لكم﴾ [الغافر:٦٠] یہ آیت امت محمدیہ کا خاص اعزاز ہے کہ ان کو دعاء مانگنے کا حکم دیا گیا اور اس کی قبولیت کا وعدہ کیا گیا اور جو دعاء نہ مانگے، اس کے لئے عذاب کی وعید آئی ہے، چنانچہ سنن ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ ﷺ کی روایت ہے: "من لم يسألِ الله يغضب عليه" جو دعاء نہیں مانگتا، اس سے اللہ ناراض ہوتے ہیں۔ ولِلّٰهِ درّ القائل

الرب يغضب ان تركت سُئواله　　وبني آدم حين يُسئل يغضب

مسلمان جو بھی دعاء اللہ سے کرتا ہے اللہ اس کو عطا فرماتا ہے، بشرطیکہ اس میں کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ ہو، اور قبول فرمانے کی تین صورتوں میں سے کوئی صورت ہوتی ہے، ایک یہ کہ جو مانگا وہی مل گیا دوسرے یہ کہ اس کی مطلوب چیز کے بدلے اس کو آخرت کا کوئی اجر وثواب دے دیا گیا، تیسرے یہ کہ مانگی ہوئی چیز تو نہ ملی، مگر کوئی آفت ومصیبت اس پر آنے والی تھی وہ ٹل گئی۔ (مسند احمد)۔ کافر کی دعاء اگر دنیا سے متعلق ہو، تو قبول ہوسکتی ہے اور اگر آخرت سے متعلق ہو تو قبول نہ ہوگی۔

ويملك كلَّ شيء ولايملكه شيء ولاغِنىً عن الله طرفة عين وَمَنِ استغنى عن الله طرُفة عين فقد كفر، وصار من أهل الحَين.
اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مالک ہے اس کا کوئی مالک نہیں اللہ تعالیٰ سے پلک جھپکنے کی مقدار اور ایک لحظہ بھی کوئی بے نیاز نہیں ہوسکتا اور جو شخص لحظہ بھر بھی اللہ تعالیٰ سے بے نیاز ہوگیا تو اس نے کفر کا ارتکاب کیا اور وہ ہلاکت زدہ لوگوں میں شمار ہوگیا۔

الحين: بالفتح: ہلاکت

وإن اللّٰه تعالیٰ یغضَب ویرضٰی لا کأحدٍ من الوریٰ.

اللہ تعالیٰ ناراض بھی ہوتا ہے اور خوش بھی لیکن اس کی ناراضی اور خوشی مخلوق جیسی نہیں ہوتی۔

"لا کأحدٍ من الوریٰ" میں نفی تشبیہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے غضب، رضا، عداوت، محبت اور بغض جیسی صفات قرآن وحدیث سے ثابت ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنی صفات پر قیاس کرنا سخت نادانی ہے، جمہور سلف اس قسم کی صفات کی تشریح ہی سے توقف کرتے ہیں، کیونکہ ارشاد ہے: ﴿لیس کمثله شيء﴾ مخلوقات کو اللہ سے کچھ بھی مشابہت نہیں۔ مثلاً جب کسی آدمی کو غیظ وغضب آتا ہے تو اس کے نتیجے میں غلیان دم القلب (قلب کے خون کے جوش مارنے) کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، جبکہ اللہ کی صفت میں غضب کا یہ نتیجہ ہرگز نہیں ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات قلب اور دم سے منزّہ ہے، بلکہ فرشتوں کے لئے بھی صفت غضب ثابت ہے، مگر وہ بھی انسان کے غضب کی کیفیت کے مماثل نہیں، کیونکہ عند الغضب قلب کے خون کے جوش مارنے کا تصور ان میں بھی نہیں۔

ونُحبُّ أصحَابَ رَسُولِ اللّٰه ﷺ ولا نُفرِّط في حُبِّ أحَدٍ منهم ولا نتبرَّأُ مِن أحَدٍ منهم ونُبغِضُ من يُبغِضهم وبغير الخير يذكرهم ولانذكرهم إلا بخير. وحُبُّهم دينٌ و إيمانٌ وإحسانٌ وبُغضهم كفرٌ و نِفَاقٌ وطُغيانٌ.

ہم اصحاب رسول اللہ ﷺ سے محبت کرتے ہیں اور ہم (شیعوں کی طرح) ان میں سے کسی کی محبت میں اس کے حق سے زیادہ نہیں بڑھتے اور نہ ہی ان میں سے کسی سے برأت کا اظہار کرتے ہیں ہم اس سے بُغض رکھتے ہیں، جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بُغض رکھتا ہے اور (ہم اس سے بھی بُغض رکھتے ہیں) جو ان کا اچھے انداز میں نام نہیں لیتا، ہم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ذکرِ خیر ہی کرتے ہیں، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی محبت دین، ایمان اور احسان کی علامت ہے اور ان سے بُغض کفر، نفاق اور سرکشی ہے۔

اس عبارت میں امام ابوجعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ، روافض وغیرہ کی تردید کی طرف اشارہ کررہے ہیں اور صحابہ کی عظمت بیان کررہے ہیں۔ علامہ ابن حجرؒ نے "الإصابة" میں صحابی کی تعرف یوں کی ہے: "وهو من لقي النبي صلّى الله عليه وسلم مؤمنا به ومات على الإسلام" یعنی صحابہ سے مراد وہ قدسی صفات ہستیاں ہیں، جنہوں نے بحالت ایمان، نبی ﷺ کی صحبت پائی اور تادم مرگ ایمان پر قائم رہے یہ ایسی بزرگ ہستیاں ہیں کہ انبیاء کے بعد کوئی بھی شخص خواہ کتنی ہی عبادت وریاضت کرڈالے ان کے مقام ومرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا، تمام صحابہ کرام عادل، مؤمن اور جنتی ہیں۔ قال ملاعلي القاري: "الصحابة كلهم عدول مطلقاً لظواهر الكتاب والسنة وإجماع من يعتد به." (مرقاة: ۵/۷۱۵) بہر حال صحابہ کی عظمت وتقدیس ہمارا دین وایمان ہے، قرآن وسنت اور دین کے نام سے جو کچھ بھی ہم تک پہنچا ہے وہ صحابہ ہی کے ذریعہ پہنچا ہے اگر کوئی اٹھ کران ستونوں کو گراتا ہے، تو جو کتاب وسنت ان کے ذریعہ ہم تک پہنچی اور ان پر دین کی عمارت کھڑی ہے یہ ساری منہدم ہوجائے گی۔ صحابہ کرام کی تعریف قرآن (کی سورۃ توبہ: ۱۰۰، سورۃ فتح: ۲۹-۱۸، سورۃ انفال: ۷۲، سورۃ الحدید: ۱۰ اورالحشر: ۸-۱۰) میں اللہ تعالیٰ نے خود فرمائی ہے، جناب نبی کریم ﷺ نے کئی احادیث میں صحابہ کی شان کا تذکرہ فرمایا ہے۔ جولوگ صحابہ کرام پر تنقید کی گنجائش نکالتے ہیں ان کے اندر سبائیت اور یہودیت کے جراثیم بول رہے ہیں اور بقول امام شعبی وہ یہود ونصاریٰ سے بھی بدتر ہیں؟ کیونکہ جب یہود ونصاری سے پوچھا گیا کہ تمہاری امت میں زیادہ بہتر کون لوگ ہیں؟ تو یہود نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام کے اصحاب اور نصاری نے کہا کہ حوارییّن، یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے صحابہ اور ایک یہ لوگ ہیں کہ اپنے رسول کے اصحاب کو بدترین امت ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

"ولا نتبرأُ من أحدٍ منهم: یعنی اہل سنت اعتدال کے راستے پر چلتے

ہوئے کسی بھی صحابی سے براءت کا اظہار نہیں کرتے، بلکہ تمام صحابہ بمعہ اہل بیت سے محبت کا اظہار کرتے ہیں، جبکہ روافض نے افراط سے کام لیا، چنانچہ ان کے ہاں اہل بیت کی محبت اس وقت تک کامل نہیں کہ جب تک ابوبکر، وعمر رضی اللہ عنہما سے براءت کا اظہار نہ کیا جائے، دوسری طرف خوارج نے تفریط سے کام لیکر صحابہ کو ان کے درجے سے نیچے گرایا، چنانچہ انہوں نے حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما اور اہل بیت سے براءت ظاہر کی، مودودی صاحب نے بھی صحابہ کی شان میں گستاخی کی ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے (تفہیمات طبع چہارم: ۲۹۴) اور ''خلافت وملوکیت'' نامی کتاب میں تو بغض صحابہ ﷺ کے زہر کو علانیہ اُگل دیا ہے۔

و بُغضهم كفر: یعنی صحابہ سے بغض کفر ہے، یہاں کفر سے کفر اصطلاحی مراد نہیں، بلکہ جیسے ﴿ومن لم يحكم بما أنزل الله فأولئك هم الكافرون﴾ میں کافر سے مراد عملی کافر ہے کہ ''ما أنزل الله'' کو عقیدۃً ثابت مان کر، پھر فیصلہ عملاً اس کے خلاف کرے، تو اس کی عملی حالت کافروں جیسی ہے ایسے ہی یہاں مطلب یہ ہے کہ صحابہ سے بغض کرنا کافروں جیسا کام ہے۔

خلافت

ونُثبتُ الخلافةَ بعدَ رسولِ اللّٰه ﷺ أوّلاً لأبي بكر ن الصّديق ﷺ تفضيلاً له وتقديمًا علىٰ جميع الأُمّة، ثمّ لعمر بن الخطاب، ثم لعثمان بن عفّان، ثُم لعلي بن أبي طالب رضوان اللّٰه عليهم أجمعين وهم الخلفاء الرّاشدون والائمّة المهتدون، الّذين قَضَوا بالحق وكانوا به يعدلون.

حضرت ابوبکر صدیق ﷺ کو ہم رسول اللہ ﷺ کا پہلا خلیفہ مانتے ہیں، اس لئے کہ وہ امت میں افضل ترین ہستی تھے، ان کے بعد درجہ بدرجہ حضرت عمر بن خطاب ﷺ کو دوسرا، حضرت عثمان بن عفان ﷺ کو تیسرا اور حضرت علی ابن ابی طالب ﷺ کو چوتھا، خلیفہ تسلیم کرتے ہیں اور یہ خلفاء راشدین ہیں اور ہدایت یافتہ امت کے امام ہیں۔

قرآن وحدیث کی روشنی میں اسلاف کا اس پر اتفاق ہے کہ حضور ﷺ کے بعد عیسیٰ علیہ السلام (جو چوتھے آسمان پر زندہ موجود ہیں) کے علاوہ باقی تمام انسانوں سے افضل ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں، آپ رضی اللہ عنہ کا نام عبداللہ، لقب صدیق اور عتیق اور کنیت ابوبکر ہے۔
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو آنحضرت ﷺ نے اپنے مرض وفات میں اپنی جگہ پر امام نماز بنادیا تھا، آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔

"مُروا أبابكرٍ فليصلِّ بالنّاس" (بخاری:٦٦۴) اب یہ کھلا ہوا اشارہ ان کی خلافت کا تھا (اس آخری وقت کے علاوہ بھی جب کبھی آنحضرت ﷺ خود امامت نہ کرسکتے، تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ ہی کو امامت کا حکم دیتے)

تفصیل کے لئے: خلفاء راشدین:۴۴، مولانا عبدالشکور لکھنوی)

نیز اس بیماری میں آپ ﷺ نے ان کے لئے خلافت نامہ لکھوانے کا کاغذ وغیرہ طلب فرمایا، مگر پھر کسی مصلحت سے اپنا ارادہ ترک کردیا اور فرمایا: سوائے ابوبکر کے اور کسی کے لئے اللہ کی مشیت نہ ہوگی اور مسلمان بھی راضی نہ ہوں گے۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث:٢٣٨٧) عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ اول ہوں، کیونکہ جس ترتیب سے خلفاء راشدین دنیا سے کوچ کرگئے ہیں، اس ترتیب سے ان کو خلافت ملی ہے اور یہ طے ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ انتقال کرگئے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ خلیفہ اول اور خلفیہ بلافصل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ پیغمبر پاک ﷺ کی وفات کے بعد حضور ﷺ کے دفن سے قبل انصار کے ایک قبیلہ بنوساعدہ کے دالان اور برآمدہ میں مہاجرین وانصار سب کا اتفاق حضرت صدیق رضی اللہ عنہ پر ہوگیا اور موجودہ لوگوں نے ان کے دست حق پرست پر بیعت کرلی، بیعت کی ابتداء ایک انصاری سے ہوئی۔ (تاریخ الخلفاء)

اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، مستحق خلافت نہ ہوتے تو صحابہ ان کی خلافت پر اجماع نہ کرتے، کیونکہ ازروئے حدیث یہ امت کبھی باطل پر اجماع نہ کرے گی۔

حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کے متعلق بعض روایات میں ہے کہ انہوں نے بلاتوقف ابتدا ہی میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بیعت کرلی تھی۔ (فتح الباری: ۳۷۹/۷) میں ہے ''وقد صحح ابن حبان وغیره من المحدثين حديث أبي سعيد الخدري أن عليا بايع أبابكر في أول الأمر'' اور صحیح بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ چھ مہینے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیعت کی تھی، ممکن ہے کہ انہوں نے دومرتبہ بیعت کی ہو، پہلی بیعت مجمع عام میں نہ ہوئی ہو، اس لئے عام لوگوں کو غلط فہمی سے بچانے کے لئے چھ مہینے کے بعد مجمع میں بیعت کی۔ حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کا یہ قول: ''خير الأمة بعد نبيها أبو بكر ثم عمر'' بھی کتب احادیث میں موجود ہے۔

خلیفہ اول سیدنا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ۱۱/لاکھ مربع میل پر، ۲/سال ۳/ماہ ۹/دن خلافت کرکے، تریسٹھ برس کی عمر میں ۲۲/جمادی الاخریٰ ۱۳ھ بروز ہفتہ بمطابق ۲۳/اگست ۶۳۴ء کو مغرب وعشاء کے درمیان اس دار فانی سے رحلت کی۔ اللہ کے پیارے رسول ﷺ کے پہلوئے مبارک میں دفن ہوئے یارِ غار اور مزار کا لقب پایا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے رحلت سے قبل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بلایا اور ان سے ابوحفص، حضرت عمر فاروق بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خلافت کے سلسلے میں اپنا عہد نامہ لکھ کر اس صحیفہ کو مہر بند کیا اور لوگوں کے سامنے اس کو پیش کیا اور انہیں اس شخص کے لئے بیعت کرنے کا حکم دیا جو صحیفہ میں ہو، تو صحابہ نے بیعت کی حتی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا انہوں نے فرمایا: ''بايعنا لمن فيها وان كان عمر.'' ہم نے اس شخص کی بیعت کی جو اس میں ہے اگرچہ وہ عمر رضی اللہ عنہ ہی کیوں نہ ہوں۔ اس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اتفاق ہوگیا سب سے پہلے عمر رضی اللہ عنہ کو امیر المؤمنین کا لقب دیا گیا۔ خلیفہ ثانی سیدنا عمر فاروق نے ۲۲/لاکھ مربع میل پر ۱۰/سال ۵/ماہ ۴/دن خلافت کرکے ۲۶/ذوالحجہ ۲۳ھ فجر کے وقت حالت امامت میں ابولؤلؤ فیروز مجوسی ایرانی کے حملے سے زخمی ہوئے اور تریسٹھ برس کی عمر یکم محرم ۲۴ھ کو انتقال

فرمایا۔ شہادت کے مرتبہ پر فائز ہوکر پہلوئے نبوت میں دفن ہوئے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے زخمی حالت میں مسئلہ خلافت کو چھ حضرات کی کمیٹی ،عثمان ،علی ،عبدالرحمٰن بن عوف ،طلحہ ، زبیراور سعد بن ابی وقاص رضوان اللہ علیہم کے باہمی مشورہ پر چھوڑ گئے ، پھران میں سے پانچ نے معاملہ عبدالرحمٰن بن عوف کے سپرد کردیا اوران کے فیصلے پر رضا مندی ظاہر کردی، تو انہوں نے ابوعبداللہ حضرت عثمان بن عفان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کو منتخب کیا اور صحابہ کی ایک مجلس میں ان سے بیعت کی ، پھر دوسرے لوگوں نے ان سے بیعت کی اس طرح سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اجماع ہوگیا۔ خلیفہ ثالث سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے ۲۴/لاکھ مربع میل پر ۱۲/سال ۱۱/یوم خلیفہ رہے۔ ۸۲/برس کی عمر میں ۱۸/ذوالحجہ ۳۵ھ کو ایک سازش کے تحت انتہائی مظلومیت کی حالت میں اسود التجیبی کے ہاتھوں شہید ہوکر جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تو شہید ہوگئے ،مگر خلیفہ کا معاملہ بغیر طے کئے لوگوں پر چھوڑ گئے ،تو بڑے بڑے مہاجرین وانصار نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اتفاق کیا اور ان سے منصب خلافت قبول کرنے کی درخواست کی اوران سے بیعت کی ، کیونکہ وہ اپنے ہم عصروں میں افضل اور خلافت کے زیادہ حقدار تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کا نام علی ، لقب اسداللہ اور مرتضیٰ اور کنیت ابوالحسن اورابوتراب ہے۔ خلیفہ رابع سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ ۴/سال ۹/ماہ خلافت کرنے کے بعد ۲۱/رمضان المبارک ۴۰ھ میں عبدالرحمان ابن ملجم کے ہاتھوں فجر کے وقت جامع مسجد کوفہ میں داخل ہوتے ہی شہید ہوئے۔

عشرہ مبشرہ

وأنّ العشرةَ الّذين سمّاهم رسولُ اللّٰه ﷺ وبشّرهم بالجنّةِ نشْهد لهم بالجنّة على ماشهِد لهم رسولُ اللّٰه ﷺ وقولُه الحق، وهم: أبوبكر، وعمر، وعثمان، وعلي وطلحة، والزُّبير. وسعد، وسعيد وعبدالرحمن بن عوف، وأبوعبيدة بن الجرّاح، وهو أمين هذه الأمّة ﷺ.

وہ دس صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، جن کا رسول اللہ ﷺ نے نام لیا اور انہیں جنت کی خوشخبری دی ہم ان کے جنتی ہونے کی گواہی اس بناء پر دیتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اس کی گواہی دی آپ کا فرمان برحق ہے اور وہ دس صحابہ کرام یہ ہیں، ابوبکر وعمر وعثمان وعلی وطلحہ، زبیر، سعد، سعید، عبدالرحمٰن بن عوف، رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اور ابوعبیدہ بن الجراح ﷺ جو اس امت کے امین ہیں۔

خلاصہ یہ کہ جن دس صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے جنتی ہونے کی بشارت مشہور ہے، ان میں خلفاء راشدین کے علاوہ چھ مزید صحابہ کرام طلحہ، زبیر، سعد، سعید، عبدالرحمان بن عوف اور ابوعبیدہ بن الجراح رضوان اللہ علیہم بھی شامل ہیں، یہ دس تو ''عشرہ مبشرہ'' کے نام سے مشہور ہیں، مگر ان کے علاوہ بھی صحابہ کی بعض جماعتوں مثلاً اصحاب بدر اور اصحب بیعتِ رضوان کے بارے میں اور بعض افراد مثلاً حضرت فاطمہ، حضرت حسن، حضرت حسین، حضرت بلال، حضرت سعد بن معاذ اور حضرت سلمان فارسی رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ کے بارے میں بھی جنت کی بشارت احادیث صحیحہ میں وارد ہے، لیکن چونکہ مذکورہ دس حضرات کے جنتی ہونے کی بشارت ایک ہی حدیث۔ (ترمذی اور ابوداؤد میں) میں وارد ہے اس بناء پر ان کے جنتی ہونے کی بشارت مشہور ہوگئی اور وہ عشرہ مبشرہ کہلائے۔

ومن أحسن القولَ في أصحاب النبي ﷺ وأزواجه الطاهرات من كـل دَنَـس وذرِّيَّاتـه الـمقدَّسِين من كل رِجس. فقد برئ من النفاق.

جس نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم، ازواج مطہرات جو ہر عیب سے پاک ہیں اور آپ ﷺ کی اولاد، جو ہر قسم کی خباثت سے پاک ہیں، کے متعلق اچھا تذکرہ کیا جو برائی سے خالی ہو، وہ نفاق سے بری ہوا۔

روافض، صحابہ اور ازواج مطہرات کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں، جبکہ اہل سنت کی شان یہ ہے کہ وہ صحابہ کرام، ازواج مطہرات کے علاوہ حضرت فاطمہ، علی، حسن اور حسین رضوان اللہ علیہم سب کی عقیدت ومحبت کے قائل ہیں۔ ایں خانہ ہمہ آفتاب است، امام طحاویؒ نے یہ جو فرمایا: "فـقـد بـرئ مـن النِفاق" اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ روافض وشیعیت کا بانی ایک منافق اور زندیق شخص عبداللہ بن سباء تھا جو اپنے مکر وفریب سے اسلام کا چہرہ مسخ کرنا چاہتا تھا، اس لئے بغض صحابہ اور بغض ازواج مطہرات نفاق کی علامت ہے۔ جو سب کا تذکرہ بھلائی کے ساتھ کرے گا نفاق سے بری ہوگا۔

وعُلماء السّلف من الصّالحين والتابعين ومن بعدهم من أهل الـخيـر والأثـر، وأهـلِ الـفـقـه والـنّظر لايُذكرون إلابالجميل ومن ذكرهم بسُوءٍ فهو على غير السّبيل.

علماء سلف صالحین اور تابعین اور جو لوگ ان کے بعد ہوئے، جن کا تعلق اہل خیر ومحدثین سے یا فقہ ونظر سے ہو، ہم ان کا ذکر جمیل ہی کرتے ہیں جو ان کا برائی سے ذکر کرے وہ سیدھی راہ پر نہیں۔

علامت قیامت میں سے ایک بات یہ ہے کہ "والعن آخرُ هذه الاُمّة اوّلها"

(ترمذی:۲/۴۴)

اس امت کے پچھلے لوگ اگلے لوگوں پر لعن طعن کریں گے۔ اس دورِ پرفتن میں جہاں حضور ﷺ کی ذکر کردہ دوسری علامات کا ظہور ہورہا ہے، وہیں اس علامت کا بھی پوری طرح ظہور ہورہا ہے۔ امام طحاویؒ کی غرض یہ ہے کہ تمام ائمہ سلف کے ساتھ نیک گمان رکھا جائے، دل سے ان کا احترام کیا جائے اور سمجھا جائے کہ ان میں سے ہر ایک نے کتاب وسنت اور صحابہ کرام کے طرزِ عمل کا مطالعہ اور اس میں غور وفکر کے بعد جو کچھ اپنے نزدیک زیادہ راجح سمجھا ہے، نیک نیتی سے اس کو اختیار کرلیا ہے ان میں سے کوئی بھی باطل پر نہیں۔

ولا نُفضِّلُ أحدًا من الأولياء على أحدٍ من الأنبياء عليهم السّلام ونقول: نبيٌّ واحدٌ أفضل من جميع الأولياء.

ہم کسی بھی ولی کو کسی نبی پر فضیلت نہیں دیتے، ہمارا یہ عقیدہ ہے، کہ ایک نبی تمام اولیاء سے افضل ہے۔

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ کوئی بھی اُمتی خواہ کتنی ہی عبادت وریاضت کرڈالے، انبیاء کے مرتبہ اور مقام کو نہیں پہنچ سکتا۔

بعض کرامیہ نے کہا ہے کہ "**الولاية أفضل من النّبوّة**" اور ان میں سے بعض کا مقولہ ہے کہ "اولیاء کی ابتداء انبیاء کی انتہاء ہے، مگر یہ باتیں حقیقت سے بہت دور ہیں، حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے، یعنی انبیاء کی جہاں سے ابتداء ہوتی ہے وہ اولیاء کی انتہاء ہے، بقول شیخ مجدد الف ثانیؒ کے کہ: "کمالات ولایت، کمالات نبوت کے مقابلہ میں وہی نسبت رکھتے ہیں جو قطرہ کو سمندر کے ساتھ ہے"، حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ (۶۶۱-۷۸۶ھ) نے تو یہاں تک لکھا کہ: انبیاء کی ایک سانس اولیاء کی پوری زندگی سے افضل ہے۔ ولی کی ولایت اتباع رسول پر موقوف ہے۔ اتباع رسول کی وجہ سے ولی کو ولایت حاصل ہے (ولی کی کرامت نبی کا معجزہ ہے، بیان القرآن: ۷۶/۸) علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: "**وكرامات أولياء الله إنما حصلت ببركة إتباع رسوله صلّى**

اللّٰه عليه وسلم فهي في الحقيقة تدخل في معجزات الرسول صلّى اللّٰه عليه وسلم" (فتاویٰ ابن تیمیہ: ۱۱/۲۷) اس کے علاوہ بات یہ ہے کہ نبوت ایک وھبی مقام ہے، جبکہ ولایت کسبی ہے، بہر حال مقام نبوت ولایت سے افضل ہے، واضح رہے کہ ہر نبی ولی ہوتا ہے، مگر ہر ولی نبی نہیں ہوتا گویا نبی میں نبوت بھی ہے، ولایت بھی ہے، مگر ولی میں صرف ولایت ہے وہ بھی نبی کی ولایت سے کم۔

نوٹ: انبیاء معصوم اور اولیاء محفوظ ہیں۔ معصوم وہ ہے کہ اس سے باوجود استعدادِ گناہ، گناہ سرزد ہونا محال ہو اور محفوظ وہ ہے کہ گناہ اس سے ممکن ہو، اگر چہ واقع نہ ہو، پہلی صورت مستلزم محال ہے، دوسری ممکن، غیر واقع ہے۔ (از ارشادات شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ)

ونُؤمن بمَاجاء من كراماتهم وصحّ عن الثِّقاتِ منْ رواياتهم.

ہم اولیاء کرام کی کرامات کو مانتے ہیں اور ان کی روایت کو بھی مانتے ہیں، جو ثقات اور معتبر لوگوں سے صحیح طریقے سے ثابت ہوتی ہیں۔

معجزہ اور کرامت کا فرق

جو خرق عادت مکذبین نبوت کے الزام اور تعجیز کے لئے نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہو، وہ معجزہ ہے اور اگر اس خرق عادت سے مقصود محض تشریف اور تکریم ہو، تو وہ کرامت ہے خواہ نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہو یا ولی کے، لہٰذا معجزہ نبی کے ساتھ مخصوص ہے اور کرامت عام ہے (نسیم الریاض شرح شفاء قاضی عیاض "باب الرابع" (بحوالہ علم الکلام: ۲۸۱) ایک فرق معجزہ اور کرامت میں یہ ہے کہ معجزہ کا اظہار ضروری ہے بخلاف کرامت کے کہ اس کا اخفاء ضروری ہے۔ إلا عن ضرورة (اليواقيت والجواهر) خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا ملفوظ ہے: "فرض اللّٰه تعالىٰ على أولياء ه كتمان الكرامة كما فرض على أنبيائه إظهار المعجزة." (مجلس ۱۱، ۴: ۵۸۸) واضح رہے کہ کرامت اور معجزہ میں اسباب طبیعہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا، بلکہ وہ براہ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، معجزہ اور

کرامت دونوں، نبی اور ولی کے اختیار میں بھی نہیں ہوتے، بلکہ جب اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں ،تو معجزہ نبی کے ہاتھوں اور کرامت ولی کے ہاتھوں ظاہر فرمادیتے ہیں۔

اقسام خارق عادت

جو چیزیں خارق عادت ہوں ان کا صدور نبی سے ہوگا یا غیر نبی سے، اگر نبی سے ہے تو دعویٰ نبوت سے پہلے ہوگا یا بعد میں ہوگا، اگر دعویٰ نبوت سے پہلے ہے تو اس کو ''ارھاص'' کہتے ہیں، اگر ان خارق عادت چیزوں کا صدور دعویٰ نبوت کے بعد ہو تو وہ ''معجزہ'' ہے اور اگر خارق عادت کا صدور غیر نبی سے ہو، تو ولی سے ہوگا یا غیر ولی سے ہوگا، اگر ولی سے ہو تو اس کو ''کرامت'' کہتے ہیں، اگر غیر ولی سے ہوگا تو عام مؤمن (کہ جس کا صالح و فاسق ہونا معلوم نہ ہو) سے ہوگا یا کافر و فاسق سے ہوگا اگر عام مؤمن سے ہو تو اس کو ''معونت'' کہتے ہیں، اگر کافر و فاسق سے ہو تو اس کو ''استدراج'' کہتے ہیں، اور اگر کوئی خرق عادت مدعی نبوت کے مقصد اور مطلب کے بالکل خلاف ظاہر ہو۔ (جیسے مسیلمہ کذاب نے ایک کانے شخص کی آنکھ پر تھوک لگایا تا کہ یہ آنکھ درست ہو جائے، لیکن قضاء الٰہی سے دوسری آنکھ بھی نابینا ہوگئی) تو اس کو ''اھانت'' اور ''خذلان'' کہتے ہیں یعنی اللہ کی طرف سے یہ رسوائی ہے۔

معتزلہ نے کرامت کا انکار اس لئے کیا ہے کہ: اگر اولیاء سے کرامت ظاہر ہو جائے تو کرامت کے معجزہ ہونے کا شبہ ہوگا، کیونکہ دونوں امر، خارق العادت ہیں، ایسی صورت میں، غیر نبی کو لوگ نبی سمجھ بیٹھیں گے، لیکن معتزلہ کی یہ بات غلط ہے، کیونکہ کرامت جس شخص کے ہاتھ پر ظاہر ہوتی ہے وہ مدعی نبوت نہیں ہوتا، برخلاف معجزہ کے ،کہ وہ مدعی نبوت کے ہاتھ پر ظاہر ہونے والا خارق عادت امر ہے، اس لئے کرامت کے معجزہ ہونے کا شبہ نہیں ہوسکتا، حضرت مریم علیہا السلام کی کرامت کا ذکر قرآن کریم میں ہے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خط سے دریاء نیل کا جاری ہو جانا اور ''نہاوند'' میں اپنے لشکر دیکھ کر یا ساریۃَ الجبلَ کہنا اور ان لوگوں کا سن لینا تواریخ میں تواتر کے ساتھ

منقول ہیں۔

فائدہ: حضرت اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں: ''اگر اتباع سنت نہیں تو کچھ بھی نہیں چاہے ہوا پر اڑتا ہو یا پانی پر چلتا ہو۔ (ملفوظات)

علامات قیامت

ونؤمن بأشراط السّاعةِ منها: خروج الدجّال ونزولُ عيسٰى عليه السلام من السّماء ونؤمن بطلوع الشمس من مغربها وخروج دابّة الأرض من موضِعها.

ہم علامات قیامت پر ایمان ویقین رکھتے ہیں، مثلاً دجال کا خروج عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کا آسمان سے نازل ہونا سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، ''دابۃ الارض'' کا اپنی جگہ سے نکلنا۔

اللہ کے رسول ﷺ نے جن علامات قیامت کی خبر دی ہے ان علامات قیامت پر ایمان لانا واجب ہے۔ ان علامات قیامت کی تفصیل اور توضیح سیر، تاریخ اور حدیث وتفسیر کی کتابوں میں موجود ہے۔ **وقد أفرد النّاسُ أحاديث أشراط السّاعة في مصنفات مشهورةٍ.**

قیامت کی علاماتِ صغریٰ تیس ہیں جن کا ذکر مختلف احادیث میں ہے اور علامات کبریٰ بارہ یعنی ظہور مہدی علیہ السلام، خروج دجّال، نزول عیسیٰ علیہ السلام، یاجوج ماجوج، دھویں کا ظاہر ہونا، زمین کا دھنس جانا، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، صفاء پہاڑ سے جانور کا نکلنا، ٹھنڈی ہوا کا چلنا اور تمام مسلمانوں کا وفات پا جانا، حبشیوں کی حکومت اور بیت اللہ کا شہید ہونا، آگ کا لوگوں کو ملک شام کی طرف ہانکنا، صور پھونکا جانا اور قیامت کا قائم ہونا۔

یہاں امام طحاویؒ نے علامات کبریٰ میں سے خاص کر چار کا تذکرہ کیا ہے۔

اب یہاں چند امور کی وضاحت ضروری ہے (۱) دجال یہود کی قوم کا ہے جس کا لقب مسیح ہے۔ فتنوں کے زمانہ میں جو کچھ دجال سے احیاء واماتت اور خوارق کا ظہور ہوگا یہ ظہور

موجب التباس اور اشتباہ نہیں، کیونکہ بخاری میں ہے: ”وأن المسيح الدّجال أعورُ عينِ اليمنى“ مسیح دجال کی دائیں آنکھ کانی ہوگی، جبکہ اللہ تعالیٰ کانا نہیں۔ (بخاری:۲/۱۰۵۵)

ایسے ہی دجال کے بارے میں صحیح مسلم کی حدیث ہے: ”مكتوب بين عينينه كافر، يقرأه مؤمن كاتب وغير كاتب“ دجال کی پیشانی پر کافر لکھا ہوا ہوگا، جس کو ہر مؤمن پڑھے گا خواہ پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ ہو۔ (۲) حضرت عیسیٰ علیہ السلام دمشق کی جامع مسجد کے مشرقی جانب کے سفید رنگ کے مینار پر نازل ہوں گے، نزول کے بعد ۴۰ یا ۴۵ رسال قیام کریں گے۔ باب ”لُــد“ (جوکہ آج کل اسرائیلوں کا ائیر پورٹ ہے) پر دجال کو قتل کریں گے۔ دیگر تفاصیل احادیث میں ہیں۔ اب قادیانی مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لئے ایک اعتراض پیش کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اترنے کے بعد منصب نبوت پر فائز ہوں گے یا نہیں؟ اگر وہ بحیثیت نبی آجائیں گے، تو ختم نبوت پر زد پڑتی ہے، اگر نبی نہیں ہوں گے، تو ایک نبی کا نبوت سے معزول ہونا لازم آتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے خاتم الانبیاء ہونے کا معنی یہ ہے کہ آپ ﷺ کے بعد کسی کو جدید منصب نبوت پر فائز نہیں کیا جائے گا، ختم نبوت کا معنی عطاء نبوت کی بندش ہے جس پر مہر لگ گئی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو آپ کی آمد سے صدیوں پہلے منصب نبوت پر فائز ہو چکے ہیں، اب کہ مرتبہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے تو آپ کی نبوت موقوف ہوگی، سلب نہ ہوگی، یعنی آپ نبوت سے معزول نہیں ہوں گے لیکن امت محمدیہ میں ان کی نبوت کا قانون نافذ نہیں ہوگا، صرف حضور ﷺ ہی کا نافذ ہوگا اور قانون محمدی پر عمل کرنے کی وجہ سے آپ حضور ﷺ کے اُمتی کی حیثیت سے ہوں گے، مگر مسلوب النبوت ہوکر ایک عام خالص امتی کی طرح ہرگز نہیں ہوں گے۔ جیسے ایک شخص ملک پاکستان کا صدر ہے وہ سعودی عرب کے سرکاری دورے پر جاتا ہے، اب ظاہر ہے کہ وہ ذاتی صدارت کے منصب سے معزول نہیں ہوا، لیکن سعودی عرب جاکر اس کا حکم بھی نہیں چلے گا، وہاں پر حکم سعودی عرب کے بادشاہ کا

چلے گا اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال سمجھیں۔ (۳)"دابة الأرض" ایک عجیب الخلقت جانور ہوگا یہ عام جانوروں کی طرح توالد وتناسل کے طریق پر پیدا نہیں ہوگا، بلکہ اچانک زمین سے نکلے گا۔ اس کا خروج مکہ مکرمہ میں ہوگا (شاہ عبدالقادرؒ نے موضح القرآن میں لکھا ہے کہ: "صفا پہاڑ مکہ کا پھٹے گا اس میں سے ایک جانور نکلے گا) پھر ساری دنیا میں پھرے گا یہ کافر ومؤمن کو پہنچانے گا اور ان سے کلام کرے گا ہر کافر کے چہرے پر کفر کا نشان لگا دیگا۔ (معارف القرآن: ۶/۶۰۵)

ولانصدِّق كاهنًا ولاعَرَّافًا، ولا مَنْ يَدَّعي شيئًا يُخالف الكتاب والسنَّة وإجماعَ الأُمَّة.

ہم کسی کاہن نجومی کو سچا اور صادق نہیں سمجھتے اور نہ ہی اسے سچا مانتے ہیں جو کتاب وسنت اور اجماع کے خلاف کوئی دعویٰ کرے۔

كاهن: من يخبر عن المغيبات. **عرّاف**: نجومی. وقيل: العرّاف يخبر عن الماضي والكاهن يخبر عن الماضي والمستقبل (المصباح)

مسند احمد میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: "من أتى عرّافًا أو كاهنًا. فصدَّقه بما يقول فقد كفر بما أنزل على محمد ﷺ" جو شخص کسی کاہن (غیب دانی کا مدعی، یا نجومی) کے پاس آئے اور اس کی کہی ہوئی بات کو سچ جانے تو اس نے اس کتاب کا انکار کیا جو اللہ نے محمد ﷺ پر نازل کی۔

مسلم کی حدیث ہے: "مَنْ أتى عَرَّافًا فَسَألَهُ عَنْ شيءٍ لم تُقبَلْ لهُ صلاة أربعين ليلة"

بہر حال علم نجوم کوئی یقینی علم نہیں، بلکہ محض تخمین پر مبنی ہے اور کہانت بھی اسی طرح ہے، لہٰذا ان علوم سے حاصل شدہ توہمات پر یقین کرنا ہرگز جائز نہیں، خصوصاً کسی شخص کو مجرم قرار دینے کے لئے قطعاً حجت نہیں، عملیات کے ذریعہ کسی کو واقعتاً چور سمجھنا جائز نہیں۔

وَنَرَى الجماعة حقًّا وصَوابًا والفُرقَةَ زيغًا وعَذَابًا.

ہم جماعت کو حق اور درست سمجھتے ہیں اور فرقہ بندی کو کج روی اور عذاب گردانتے ہیں۔

''جماعت'' کے بارے میں صحابہ ﷺ نے پوچھا: "من هي يارسول الله؟ قال: "ماأنا عليه وأصحابي" معلوم ہوا کہ اہل سنت والجماعت فرقہ ناجیہ ہے، اہل سنت والجماعت سے ہٹ کر باقی فرق مبتدعہ ضالہ جادۂ حق سے منحرف ہوکر فرقہ بندی اور افتراق کے شکار ہیں۔

واضح رہے کہ اجتہادی اختلاف، بشرطیکہ اصول اجتہاد کے مطابق ہو، وہ ہرگز تفرقہ نہیں، صحابہ وتابعین اور ائمہ فقہاء کا اختلاف اسی قسم کا اختلاف تھا۔ تفریق وہ مذموم ہے جو اصول دین میں ہو یا فروع میں نفسانیت کے غلبہ کی وجہ سے ہو، بایں معنیٰ کہ فروعی بحثوں کو اصل دین قرار دیا جائے اور ان میں اختلاف کو جنگ وجدل اور سب وشتم کا ذریعہ بنالیا جائے، قرآن وحدیث میں جہاں بھی تفرقہ کی مذمت ہے وہ وہی تفرقہ واختلاف ہے، جو بیّنہ (پوری وضاحت) کے بعد کیا جائے۔

یادرکھئے مفسرین، محدثین، فقہاء (مذاہب اربعہ) اور حق پرست صوفیاء کرام، سب اہل سنت والجماعت ہیں، علماء دیوبند اہل سنت والجماعت سے ہٹ کر کوئی جدید گروہ اور فرقہ قطعًا نہیں، بلکہ اسی سواد اعظم اور فرقہ ناجیہ کا ایک حصہ ہے، دارالعلوم دیوبند مرکز کی طرف انتساب کی وجہ سے ان کا نام ''علماء دیوبند'' پڑ گیا۔ جو درحقیقت اس دور میں اہل سنت والجماعت اور سواد اعظم کی ایک تعبیر ہے۔

ودين الله في الأرض والسّماء واحد وهو دين الإسلام، قال الله تعالىٰ: ﴿إن الدّين عند الله الإسلام﴾[آل عمران:۱۹]

وقال الله تعالىٰ: ﴿ورضِيتُ لكم الإسلام دينا﴾[المائدہ:۳]

وهو بين الغُلُوِّ والتَّقصير، وَبَين التَّشبيه والتَّعطيل وبين الجبر والقدر، وبين الأمْنِ والْيأْسِ.

اللہ کا دین زمین وآسمان میں صرف ایک ہی ہے اور وہ دین اسلام ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''بلاشبہ دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے'' اور فرمایا: ''اور میں نے اسلام کو تمہارے لئے بطور دین پسند کرلیا، یہ دین افراط وتفریط، تشبیہ وتعطیل، جبر وقدر اور بے خوفی وناامیدی کے درمیان ہے۔

قرآن کی اصطلاح میں، لفظ دین ان اصول واحکام کے لئے بولا جاتا ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے خاتم الانبیاء ﷺ تک سب انبیاء میں مشترک ہیں اور لفظ ''شریعت'' یا ''منہاج'' یا بعد کی اصطلاحات میں لفظ ''مذہب'' فروعی احکام کے لئے بولے جاتے ہیں، جو مختلف زمانوں اور مختلف امتوں میں مختلف ہوتے چلے آئے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ دین سب انبیاء علیہم السلام کا ایک ہی تھا اور لفظ ''اسلام'' کے لفظی معنی اطاعت وفرمانبرداری کے ہیں اس معنی کے اعتبار سے ہر نبی ورسول کے زمانہ میں جو لوگ ان پر ایمان لائے اور ان کے لائے ہوئے احکام میں ان کی فرمانبرداری کی وہ سب مسلمان اور مسلم کہلانے کے مستحق تھے اور ان کا دین، دین اسلام تھا اور بعض اوقات یہ لفظ خصوصیت سے اس دین وشریعت کے لئے بولا جاتا ہے جو سب سے آخر میں خاتم الانبیاء ﷺ لیکر آئے اور جس نے پچھلی تمام شرائع کو منسوخ کردیا اور جو قیامت تک باقی رہے گا اس معنی کے اعتبار سے یہ لفظ صرف دین محمدی ﷺ اور امت محمدیہ کے لئے مخصوص ہوجاتا ہے۔ (معارف القرآن: ۳۶/۲)

في الأرض والسماء: یعنی ہمارا دین زمان اور مکان کے اعتبار سے عام ہے، اسلام کا راج زمین، سمندر، آسمان اور فضاء ہر جگہ میں ہوگا۔

قوله: ''وهو بين الغُلُوِّ والتقصير.'' ''غلو'': کے لفظی معنی حد سے نکل جانے کے ہیں اور ''تقصير'': کے معنی میں حد سے کمی کرنا، شریعت اسلامیہ کا ہر حکم معتدل اور متوسط ہے افراط وتفریط سے پاک ہے، نہ تو شریعت موسویہ کی طرح اس میں شدت اور سختی ہے۔ (مثلاً طہارت حاصل کرنے کے لئے موضع نجاست کپڑے کا کاٹنا، زکوٰۃ میں

چوتھائی مال ادا کرنا وغیرہ) اور نہ شریعت عیسویہ کی طرح حد سے زیادہ نرمی اور آسانی ہے۔(مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین میں شراب حلال تھی، سور اور مردار کا گوشت حلال تھا، قتل عمد میں قصاص واجب نہ تھا وغیرہ) شریعت اسلامیہ شدت اور خفت کے بین بین ہے۔"وخير الأمور أوسطها."

قوله: "وبين التشبيه والتعطيل، وبين الجبر والقدر، وبين الأمن والإياس".

فرقہ مشبہ کے لوگوں کے عقائد میں افراط ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ کو مخلوق کے مشابہ قرار دیا اور اس کے لئے جسم اور جہت کو ثابت کیا ہے اور فرقہ معطلہ کے عقائد میں تفریط ہے وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی نفی کرتے ہیں، ان کے برخلاف اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسم و جہت سے منزہ ہیں اور جن صفات کا ذکر قرآن وحدیث میں ہے وہ اللہ کے لئے ثابت ہیں۔ ﴿ليس كمثله شيء وهو السميع البصير﴾ میں دونوں کی تردید ہے "ليس كمثله شيء" میں مشبہ کی تردید ہے اور "هو السميع البصير." میں معطلہ کی تردید ہے۔

اسی طرح فرقہ قدریہ کے عقائد میں افراط ہے، انہوں نے بندوں کے لئے قدرت کاسبہ اور قدرت خالقہ دونوں کو ثابت کیا ہے ان کے ہاں بندہ اپنے افعال کا کاسب بھی ہے اور خالق بھی، اور فرقہ جبریہ کے عقائد میں تفریط ہے ان کے ہاں بندہ جماد محض ہے نہ اس کو کسب کی قدرت حاصل ہے اور نہ خلق کی قدرت حاصل ہے ان دونوں کے برخلاف اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ بندہ کے لئے قدرت خالقہ تو ثابت نہیں، کیونکہ وہ اللہ کے ساتھ خاص ہے۔ البتہ قدرت کاسبہ ثابت ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس نازک مسئلہ کو بہت خوبی اور آسانی سے ذہن نشین فرما دیا تھا، چنانچہ ایک شخص نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مسئلہ جبر واختیار دریافت کیا آپ رضی اللہ عنہ نے اس شخص سے فرمایا: ایک پیر اٹھا کر کھڑا ہو جا اس نے ایک پیر اٹھالیا پھر فرمایا کہ: دوسرا پیر اُٹھالے، اس نے

عرض کیا حضرت دوسرا پیر تو نہیں اٹھ سکتا۔ فرمایا: یہی حالت بندہ کی ہے نہ پورا مختار ہی ہے نہ پورا مجبور۔ (ملفوظات اشرفیہ ص/۱۱)

اسی طرح یہ دین بے خوفی اور نا امیدی کے درمیان ہے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ: ''الإيمان بين الخوف والرّجاء'' ایمان کامل خوف اور امید کے درمیان ہے، کہ تنہا خوف لوگوں کو اللہ کے رحم وکرم سے ناامید اور محض رحم وکرم پر بھروسہ ان کو خود سر اور گستاخ بنادیتا ہے۔

فهذا ديننا واعتقادنا ظاهرًا وباطنًا. ونحن بُراءُ الى اللّٰه من كل منْ خالَفَ الّذي ذَكَرْنا وبيّنا ونسْألُ اللّٰه تعالى أن يُثبِّتَنا عليه ويختمَ لنا به، ويعصمَنا من الأهْوَاء المُختلفة والاراء المتفرِّقَة والمذاهب الرّديَّة كالمُشبّهة والمعتزلة والجهميّه والجبريّةِ والقدَريَّة وغيرهم ممّن خالف السُّنَّة والجماعة واتّبع البدعة والضلالة ونحن منهم بُراءُ وهم عندناضلالٌ وأرْدِياءُ وباللّٰه العَصمة والتوفيق.

یہ (کتاب کے اول سے لیکر یہاں تک) ہمارا دین ہے اور ظاہر وباطن میں یہی ہمارا عقیدہ ہے اور ہم اللہ کے سامنے براءت کرتے ہیں اس شخص سے جو اس طریقہ کا مخالف ہو جو ہم نے کتاب میں ذکر کیا اور ہم اللہ سے سوال کرتے ہیں کہ ہم کو ایمان پر ثابت قدم رکھیں اور ہمارا خاتمہ ایمان پر فرمائے اور ہم کو مختلف خواہشات سے بچائے اور مختلف مشوروں سے بچائے اور خراب مذاہب سے بچائے۔ جیسے مشبہہ اور معتزلہ اور جہمیہ وغیرہ اور ان کے علاوہ ان لوگوں میں سے جنہوں نے سنت اور جماعت کی مخالفت کی اور گمراہی کے دوست بن گئے اور ہم ان سے بیزار ہیں اور وہی ہمارے نزدیک گمراہ اور گھٹیا ہیں۔ اللہ ہی کے ساتھ عصمت (حفاظت) اور توفیق ہے۔

مشبہۃ: مشبہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو اپنی صفات میں مخلوق سے تشبیہ دی۔اس فرقے کا بانی داؤد جواربی ہے۔

معتزلہ: معتزلہ وہ پہلا گروہ ہیں جنہوں نے عقائد کے باب میں اس چیز کے مخالف قواعد کی بنیاد رکھی، جس کو ظاہر سنت نے بیان کیا اور جس پر صحابہ ﷺ کی جماعت عمل پیرا رہی، گویا کہ معتزلہ کے تمام اصول اور ان کی تشریحات عقل وقیاس پر مبنی ہیں۔ واصل بن عطاء (۸۰ھ، ۱۳۱ھ) کو مذہب اعتزال کا بانی کہا گیا ہے، واصل بن عطاء مشہور جلیل القدر تابعی حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، حسن بصری رحمہ اللہ کی مجلس میں ایک دفعہ واصل بن عطاء بول پڑا کہ مرتکب کبیرہ نہ مؤمن ہے، نہ کافر اس طرح اس نے ایمان وکفر کے درمیان واسطہ ثابت کیا جس پر حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "قد اعتزل عنا" کہ یہ تو ہماری جماعت سے الگ ہوگیا معتزلہ نے خود اپنا نام اصحاب العدل والتوحید رکھا، مامون الرشید کے دور میں ان کی حکومت تھی۔

جهمية: یہ جہم بن صفوان ترمذی کی طرف منسوب ایک فرقہ ہے، جہم بن صفوان صفات باری تعالیٰ کی نفی اور تعطیل کا قائل تھا اور یہ عقیدہ دراصل اس نے جعد بن درھم کی تقلید کرتے ہوئے اپنایا، جہمیہ کا ایک تفرد یہ بھی ہے کہ وہ جنت اور جہنم کے فناء کے قائل ہیں اور ایمان ان کے ہاں صرف معرفت کا نام ہے۔

جبریہ: فرقہ جبریہ وہ لوگ ہیں جو افعال اختیاریہ مثلاً کفر وایمان، طاعت اور معصیت وغیرہ کے بارے میں بندہ کو مجبور محض مانتے ہیں۔ یہ فرقہ بھی جہم بن صفوان کی طرف منسوب ہے۔

قدرية: قدریہ جبریہ کے برعکس انسان کو قادر مطلق مانتے ہیں۔ قدر اور تقدیر کا انکار کرتے ہیں، احادیث میں قدریہ کو اس امت کا مجوس کہا گیا ہے، کیونکہ مجوس دو خداؤں (یزادں اور اھرمن) کے قائل ہیں، جبکہ یہ حضرات ہر ایک کو قادر مطلق کہہ کر بے شمار خداؤں

کے قائل ہیں۔ کبھی جبریہ کو بھی قدریہ کہتے ہیں، کیونکہ مسئلہ قدر میں غلو سے کام لیتے ہیں۔
واللہ سبحانہ تعالیٰ أعلم

وآخر دعوانا أن الحمدللّٰه ربّ العالمين

الحمد للّٰہ! آج بروز بدھ بوقت عشاء محرم الحرام ۱۴۲۶ھ بمطابق ۲۲ر فروری ترجمہ وتشریح عقیدہ طحاویہ اختتام کو پہنچا۔ فللّٰہ الحمد أوّلاً وآخراً

احقر العباد
زرمحمد غفرلہ

التشـريـح الـوافـی فـی حـل

مختصر القدوری

مصنف

مولانا نصیب اللہ (ابن الحاج عبدالصمد مالیزئی)
مدرس جامعہ اسلامیہ بحر العلوم سریاب کسٹم کوئٹہ

﴿......ناشر......﴾

مکتبہ عُمر فاروق

4/491 شاہ فیصل کالونی کراچی فون: 021-4594144-8352169

باب اور عنوان کے اعتبار سے جدید لغت

القَامُوسُ المُعَنوَنْ

جو تمام دفتری، ادبی، صحافتی، فنی، سائنسی، سیاسی، تجارتی اور عام زندگی سے متعلق ہزاروں جدید لُغات، محاورات، ضرب الامثال اور روزمرہ کے ضروری جملوں پر مشتمل بہترین مجموعہ

مؤلف

حضرت مولانا مفتی حضرت علی صاحب

فاضل و متخصص جامعہ فاروقیہ کراچی

تقریظ

مولانا ولی خان المظفر صاحب
استاذ حدیث جامعہ فاروقیہ

تقریظ

مولانا ڈاکٹر منظور احمد مینگل صاحب
استاذ حدیث جامعہ فاروقیہ

مکتبہ عمر فاروق رض

4/491 شاہ فیصل کالونی کراچی